عالمی اردو ادب سیریز

انتظار حسین

دن اور داستان

دن اور داستان

انتظار حسین

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

DIN AUR DASTAN
by Intezar Hussain
Edition : 2013
Rs.: 200/-

نام کتاب : دن اور داستان
مصنف : انتظار حسین
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
سرورق : اظہار احمد ندیم
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ملنے کے پتے :
: مکتبہ خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی۔ ۶ 011-23276526
: بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴
: راعی بک ڈپو، الہ آباد۔ 08423575567

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi -110095 (INDIA)
Mob: 9971775969, 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail

Composed at: Frontech Graphics. 9818303136

کھڑے ہوتے۔تائی اماں خود بھی حیران ہونے لگتیں۔انھیں تو بس اتنا پتہ تھا کہ چلے کی چالیسویں رات کو میر بو علی اپنی کوٹھڑی سے چلاتے نکلے۔"گر پڑی، گر پڑی۔" پھر حویلی کا پھاٹک پیٹنا شروع کر دیا۔ابھی بڑے ابا زندہ تھے کہ رات رات بھر عبادت کرتے، آہستہ سے جانماز سے اٹھے، پھاٹک کھولا۔میر علی پھاٹک پیٹتے تھے اور چلاتے تھے"گر پڑی، گر پڑی" بڑے ابا نے گھور کر پوچھا "کیا گر پڑی؟" وحشت میں جواب دیا "چھت۔" وہ دن اور آج کا دن کہ پھر کبھی چھت کے نیچے سونا نصیب نہ ہوا۔کبھی چھت تلے لیٹتے تو بری طرح چیختے چلاتے اور محلے والوں کی نیندوں میں خلل ڈالتے۔ دن نکلتا تو مردہ سے ہو جاتے، نہ ڈکرانا نہ بکارنا نہ کسی سے بولنا۔جھلنگے پہ بیٹھے گٹھری بنے اونگھتے رہتے۔ وہ اور تحسینہ بہت بہت دیر تک احاطے سے باہر کھڑے انھیں تکتے رہتے۔ ڈرتے حیران ہوتے، پھر آپ ہی آپ وہاں سے چل پڑتے اور ایک تھے گڈھے شاہ کہ بس تائی اماں نے انھیں دیکھا تھا۔میر بو علی آنکھوں دیکھی حقیقت تھے۔ گڈھے شاہ تائی اماں سے سنا افسانہ۔مجذوب تھے۔حویلی کی دیوار تلے ڈیرہ ڈالا تھا، انگلیوں سے زمین کھودتے رہتے۔کوئی پوچھتا تو جواب دیتے "فقیر رہنے کے لیے بناتا ہے۔" گڑھا ذرا گہرا ہوا تو اندر اس کے بیٹھ گئے۔ایک روز بڑے ابا پاس پہنچے، گزارش کی "شاہ جی حویلی حاضر ہے اس میں ڈیرا کرو۔" گڈھے شاہ بے اعتنائی سے بولے "حویلی زمین کے نیچے ہے" بڑے ابا کو برا لگا۔تڑخ کر جواب دیا "تو زمین کے نیچے ہی جاؤ اور رہو۔" دوسرے دن نہ گڑھا تھا نہ گڈھے شاہ تھے۔

وہ اور تحسینہ سنتے اور حیران ہوتے۔تائی اماں حیران ہوتیں، پھر معنی خیز انداز میں چپ ہو جاتیں۔ پھر چپ ٹوٹتی اور کہنے لگتیں "ہمارے بڑے ابا بہت بڑے عامل تھے۔ ہمارا تو خاندان عاملوں کا خاندان ہے۔آگے ہماری پیڑھی میں ایک عامل ہوا کرتے تھے، پر بڑے ابا کے بعد سلسلہ بند ہو گیا۔"

"کیوں؟"

"کوئی گدی ان کی سنبھالنے والا جو نہ تھا۔ ابا میاں کے شغل اشغال اور تھے، باپ کے علم پر کبھی توجہ ہی نہ دی دوسروں کے پاس چلا گیا۔ کیا ہوا کہ جب بڑے ابا چرپائی پر پڑے تو ایک ننگا فقیر جانیں کہاں سے آیا، حویلی کے سامنے دھنی دے دی۔ بڑے ابا کی حالت بگڑتی چلی گئی اور اب دم اب دم ہونے لگے۔ تین دن بری حالت رہی سانس گلے میں اٹکا ہوا، وہ کرب کہ اللہ توبہ۔ بی بی تیسرے دن کیا ہوا کہ وہ ننگ دھڑنگ سنڈ مسٹنڈ ملنگ گھر میں گھس آیا۔ عورتیں چلانے لگیں۔ پر بڑے ابا نے اشارہ کیا کہ آنے دو۔ سب دم بخود، اے بی بی وہ بڑے ابا کے پاس جانے سے چمٹ گیا۔ بڑے ابا تھرتھرائے اور...... ختم...... واپس چلا گیا۔ پھر ایسا غائب ہوا کہ لوگوں نے ڈھونڈیا ڈالی پر اس کا پتہ نہ چلا...... بس اس دن سے حویلی والوں میں کوئی عامل نہیں ہوا......"

خاندان کے بزرگوں کی یادیں اور باتیں، جن بھوتوں کے قصے، کبھی کہانی کوئی، تائی اماں کی داستان ہر رنگ جاری رہتی اور رات بھیگنے لگتی اور آنکھیں اس کی نیند سے پہلے بھاری ہوتیں، پھر بند ہونے لگتیں۔ آنکھ پھر کھلتی تو سب سوئے ہوئے ہوتے، خاموشی، خراٹے، اندھیرا، خوابوں کی سرحد سے آتی ہوئی میر بوعلی کی بنکار، دل ڈر سے دھڑکتا اور دانت جاڑے سے بجنے لگتے۔ پھر پتہ چلتا کہ وہ تائی اماں کی چارپائی پہ نہیں بڑی آپا کے بستر میں ہے اور آہستہ آہستہ سرک کر وہ بالکل بڑی آپا کے پہلو میں ہو جاتا اور ان کے گداز اور محبت بھرے پہلو سے نکلتی گرمائی دھیرے دھیرے پھر اس پر نیند بن کر چھانے لگتی۔ دوبارہ آنکھ اس کی کھلتی تو پھر وہی خاموشی اور خراٹے اور اندھیرا، کالے کوس آگے کالے کوس پیچھے، سنگھی نہ ساتھی، خوابوں کی سرحد سے آتی ہوئی میر بوعلی کی بھید بھری بنکار تک سنگت چھوڑ جاتی اور نیند بھی، وہ جاگتا رہتا اور رات لمبی ہوتی جاتی اور دم اس کا ایسا الٹتا کہ بدن سے لحاف الٹ دیتا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ

دیکھنے لگتا۔ اتنے میں اچانک آواز اذان کی کان میں آتی کہ اس سے اندھیرے میں نور کی ایک لکیر کھنچتی دکھائی دیتی۔ اسے اطمینان ہوتا کہ رات اب آخر ہوئی۔ پھر لال مندر جاگتا، سنکھ اور کھڑتالیں اور گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ اندھیرے میں روشنی کا ایک بھنور پیدا ہوتا، دھیرے دھیرے ابھرتا پھیلتا اور ڈوب جاتا۔ پھر وہی خاموشی، جاگتی رات ختم ہوتے ہوتے پھر شروع ہو چلی ہے۔ اندھیرے میں پھر اس کا دم الٹنے لگتا کہ اتنے میں روئی کا پیچ بول اٹھتا۔ روئی کا ایک پیچ بولتا، پھر تھوڑے وقفے کے بعد دوسرا پیچ، پھر آوازوں کا ایک تار بندھ جاتا گویا اندھیرے کی تہہ پھٹ گئی ہے اور روشنی کی دھار بہہ نکلی ہے۔ کوئی جھوجری آواز، کوئی پتلی آواز جس میں کئی پلٹے آتے، اور ایک پیچ تھا کہ مثل ریل کے انجن کے تیزی سے سیٹی دیتا اور چپ ہو جاتا اور پھر اس سب سے موٹی اور بھاری والی آواز والے پیچ کی آواز، رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ بھاری اور یکساں آواز میں بولتا رہتا، بولتا رہتا اور وہ سمجھتا کہ صبح تک یونہی بولتا رہے گا مگر آہستہ آہستہ آواز ڈھلنے لگتی اور پھر وہی خاموشی، رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ سب سے آخری اعلان بھی تھا کہ بعد اس کے کوئی پیچ نہ بولتا اور دن میں دو پہروں کے سفر کی آخری منزل کہ وہاں پہنچ کے ٹھٹکتا اور اس سرخ اینٹوں والے موٹے ٹھس ستون کو کہ بلند ہوتے ہوتے آسمان کو چھوتا نظر آتا دیکھ کہ حیران رہ جاتا۔ فضا میں بلندیوں کی یہ انتہا زمین پر ملک کی آخری سرحد تھی، جہاں سے آگے قدم رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ اب اجنبی ملک کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ اجنبی ملک کے علاقے کو وہ دور سے دیکھتا اور واپس ہو لیتا۔

جلتی دوپہریوں میں، ہوا بند ہو یا لوں چلتی ہو یا آندھی اٹھتی ہو کہ ستر بلائیں ساتھ لاتی، آوارہ گھومنا، گھومتے رہنا، کبھی پیڑوں کی چھاؤں میں، کبھی گرم گرم بالو جیسی ریت پہ اور کبھی ہرے بھرے کھیت میں، اتنا چلنا اتنا چلنا کہ ٹانگیں دکھنے لگتیں اور تحسینہ کا گورا منھ

سرخ ہو جاتا اور بالوں کی لٹیں پسینے سے تر بتر کنپٹی پہ اور گردن پہ آ کر چپک جاتیں۔ واپس جاتے ہوئے مندروالی گلی میں، مندروالی گلی سے پیاؤ کی گلی میں جہاں پانی پیتے منھ ہاتھ دھوتے اور پھر اپنی گلی میں، مندروالی گلی سے گزرتے ہوئے اس پہ ہیبت چھا جاتی، سرخ پتھروں والا مندر کہ دھوپ میں دور سے آنچ دیتا اس کے لیے ہمیشہ ایک معمہ رہا، اس کے اندر کون رہتا ہے، آدمی کہ جن۔ سنکھ اور کھڑتالیں اور گھنٹیاں کہ روز تڑکے میں اور شام پڑے پہ بجنے لگتی ہیں، کون بجاتا ہے۔ بہت اونچائی پہ چھوٹی سی کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی چرخی کہ دوپہر میں شانت رہتی ہے اور دھوپ ڈھلنے لگتی ہے تو آپ ہی آپ گھومنے لگتی ہے اور سفید ڈوری میں بندھی ہوئی پیتل کی چمکتی دمکتی گڑوی نیچے ہوتے ہوتے کنوئیں کے اندھیرے میں چھن سے گرتی ہے۔ جانو کسی نے مٹھی بھر اشرفیاں پھینکی ہیں اور پھر غائب، پھر تھوڑی دیر میں پانی سے لبالب چمکتی دمکتی نکلتی ہے اوپر ہوتی چلی جاتی ہے اور کھڑکی کے پاس پہنچ کر اچانک گم ہو جاتی ہے۔ گڑوی کون ڈالتا ہے کون کھینچتا ہے اور یہ اتنی لمبی ڈوری کہاں سے آئی۔ سوچ کی ڈوری لمبی ہوتی چلی جاتی، اتنی لمبی کہ ہاتھ سے سرا نکل جاتا۔ اتنے میں کوئی پیلی بھڑ من کے آس پاس کی کسی کچی گچی سے اٹھتی اور اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ سرخ پتھروں والی من تو دھوپ میں اتنی تپتی کہ وہ پاؤں رکھتا تو جلنے لگتے۔ مگر آس پاس ننھی منی کچی گچیاں تھیں، جن میں پانی جمع رہتا اور جہاں کوئی اکیلی بھنبھیری سائے کی طرح منڈلاتی رہتی۔ معلق پھڑکنی بن کر گردش کرتی رہتی یا کوئی سنہری چیتوں کالے ٹیلے والی اجنبھاری کنارے پر اترتی، ڈنک کو گردش دیتی اور اڑ جاتی۔ ہاں پیاؤ کی گلی میں کہ مندروالی گلی سے آگے تھی دوپہر بھر چھاؤں رہتی اور پیاؤ چلتا رہتا۔ دونوں پانی پیتے۔ پھر اس ٹھنڈی نالی میں کھڑے ہو جاتے جو یوں اجلی تھی پر کاہی کی ہلکی تہہ جم جانے سے رپٹواں ہو گئی تھی، پیروں کے اوپر سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پھسل کر بہتا رہتا اور وہ کھڑے رہتے۔ ایک روز

اسی طرح کھڑے کھڑے اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ ایسا پھسلا کہ سارا گٹا چھل گیا۔ تحسینہ کھل کر ہنس پڑی۔ وہ روبانسا ہو گیا مگر پھر چپ ہو گیا۔ رستے بھر اسے تحسینہ پر سخت غصہ آتا رہا اور جب کھنڈال کے پیڑ پر جا کر اس نے کھنڈال کی ایک ہری پھکتی ہوئی سنٹی توڑی تو اسے تحسینہ کو دینے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔

''ضمیر ہمیں دے دے یہ سنٹی۔'' تحسینہ کے منھ میں پانی بھر آیا تھا۔

''کیوں دے دوں؟'' اس نے روکھا جواب دیا ''دے دے، ہم تجھے گھر چل کر نیلا شیشہ دیں گے۔'' اس نے پھر بڑی خوشامد بھری آواز میں کہا۔

''بڑی دے گی شیشہ، جاؤ نہیں دیتے ہم۔''

تحسینہ ایک دم سے چپ ہو گئی۔ جیسے روٹھ گئی ہو۔ وہ خود پیڑ پر چڑھنے لگی۔ پیڑ پہ وہ اچھی خاصی چڑھ گئی تھی لیکن وہ بار بار ٹوکتا۔ قدم ذرا ڈگمگایا اور اس نے شور مچایا ''وہ گری'' تحسینہ پھر سنبھل جاتی۔ آخر وہ ایک موٹے سے گدے پہ پہنچ کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور سنٹی توڑنے لگی۔ ہوا ہولے ہولے چلتی تھی۔ بار بار ذرا تیز سا جھونکا آتا اور سوکھے سنہری بال اس کے منھ پر آپڑتے اور سفید ڈھیلا پائجامہ جو اس نے آج ہی بدلا تھا، کھڑبڑ کھڑبڑ کرنے لگتا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اس کی آنکھوں میں اور آنکھوں کے ساتھ ذہن میں ایک بجلی سی کوندی۔ اس نے نیچے کھڑے کھڑے آواز لگائی ''تحسینہ ننگی'' سنٹی توڑتے توڑتے تحسینہ کے ہاتھ رک گئے۔ پاؤں اس کے اک ذرا کانپے، پھر وہ سنبھلی اور آہستہ سے نیچے اتر آئی۔ زبان سے چپ، منھ سوجا ہوا، تیوری تنی ہوئی، آنکھوں میں انگارے۔ وہ اسے دیکھ کے سہم گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی اور وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ہاتھ پاؤں شل، دل اندر سے بیٹھا جائے۔ وہ اس کے بالکل پاس آ گئی اور اس کی ڈر کے مارے بری حالت مگر غصہ بھری آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو نکل پڑے۔ تحسینہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر وہ مڑی اور ہچکیاں لیتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی۔

پاؤں سو سو من کے اور جی بیٹھا جائے۔ کنوئیں پہ بہت دیر بے سدھ کھڑا رہا۔ پانی سے بھری چرس اوپر آئی۔ ہیرا زور لگاتے ہوئے اسے اپنے پیروں کے قریب لاتا اور پوری آواز سے گاتا ع

ہو جی گنگا جمنا سرسوتی سات سندھور بھرپور

سفید بے رنگ پانی اس کے پھٹے ہوئے سفید پیروں پہ بکھرتا، پھر کنڈی میں، کنڈی سے کچی گدلی نالی میں بہتا چلا جاتا۔ وہ کھڑا رہا کھڑا رہا، پھر آپ ہی آپ چل پڑا۔

گھر کے دروازے پہ پہنچ کے وہ ٹھٹکا۔ سوچ میں پڑ گیا، اس سوچ میں کہ اندر کیسے جائے۔ ڈرتے ڈرتے ڈیوڑھی میں قدم رکھا، پھاٹک سے گزر کر دبے پاؤں دو باری میں پہنچا اور اندر کے دروازے کی دراڑ سے اندر جھانکنے لگا۔ نظر تو کچھ نہ آیا، ہاں ابا میاں کے چلانے کی آواز کانوں میں آرہی تھی۔ شاید تحسینہ نے ابا میاں سے کہہ دیا اور اس کا دل اندر سے دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ جلدی سے باہر نکلا اور الٹے پاؤں گلی میں۔ مندر کے پاس پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ کوئی آرہا تھا۔ دل کو ڈھارس ہوئی اور قدم آہستہ پڑنے لگے۔ پانی کے ننھے سے تھالے پر ایک بھنبیری جانے کب سے معلق پھرکنی سی گھومے جارہی تھی۔ دھوپ ڈھل رہی تھی مگر پنہارنیں کنوئیں پہ ابھی نہیں آئی تھیں۔ ہاں کھڑکی کی خاموش چرخی جاگ اٹھی تھی۔ چمکتی دمکتی گڑوی نیچے اترنے لگی ڈوری لمبی ہوتی گئی اور گڑوی نیچے اترتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کنوئیں کے اندر چھنا کا ہوا، اور لمبی ڈوری سمٹنے لگی۔ کھڑکی کے اندھیرے میں گم ہونے لگی اور پھر وہ سفید چمکتے موتی برساتی سنہری گڑوی بھی اندھیری کھڑکی میں گم ہوگئی۔ اس کی حیرت پھر جاگنے لگی تھی۔ خاموش چرخی کو وہ دیر تک تکتا رہا، اس بھید بھری کھڑکی کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ ایک بر نے اس کا دھیان بھٹکایا جو اس کے ہاتھ کے جھٹکے سے پرے ہٹ گئی اور پھر اسی پانی کے ننھے منے تھالے پہ جا بیٹھی جہاں کئی پیلی پیلی بریں اور بیٹھیں تھیں۔ انھیں

دیکھ کے اسے اپنی کھنڈال کی قیچی یاد آ گئی جسے وہ وہیں کھنڈال کے درخت کے نیچے پھینک آیا تھا اور جو اس وقت ہوتی تو ان ساری بروں کو سنگھوا لیتا۔ اسے پھر ساری بات یاد آ گئی اور جی ڈھینے لگا۔ وہ اداس اداس پھر چلنے لگا۔ پیاؤ کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے پیاس لگنے لگی۔ اوک سے پانی پیا کہ کھاری تو نہیں پھیکا پھیکا ضرور لگا اور شاید ایسا ٹھنڈا بھی نہیں تھا۔ پیاس بجھ کر بھی بے بجھی رہی۔ پیاؤ کی گلی سے سڑک پہ چلا آیا۔ جہاں دھوپ ڈھلنے پہ کئی چاٹ والے آ بیٹھے تھے۔ ایک میلا نچا کھسا کتا اس طرف بھوکی نظریں جمائے کھڑا تھا کہ کوئی گاہک دہی بڑے کھا کے پتا پھینکتا تو لپک کے آتا اور چاٹنا شروع کر دیتا۔

بازار کی جن جانی بوجھی دکانوں پر وہ گھنٹوں بے مقصد دیر تک شوق سے کھڑا رہتا اور کبھی دس سروں والے راون کی تصویر اور کبھی دھڑ دھڑ جلتی ہوئی لنکا کے اوپر سے اڑتے ہوئے ہنومان جی کی تصویر کو تکتا رہتا اور کبھی اس سوچ میں پڑ جاتا کہ یہ کالا سانپ کہ گردن میں البیٹ دیے سر پہ پھن پھیلائے کھڑا ہے شو جی کا پھنکار کیوں نہیں مارتا۔ ان میں سے ہر دکان پہ رکا، کھڑا ہوا، کھڑا رہا اور بے زار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ آخر دکانوں کے چراغوں میں بتی پڑی، لیمپ اور لالٹینیں جلنے لگیں اور وہ پھر گھر کی طرف چلنے لگا۔

''کون؟ ضمیر؟ اندھیرے میں کھڑا ہے؟ کیوں، کہاں تھا اب تک؟''

سینے میں امنڈتا ہوا غبار گلے اور آنکھوں کی راہ امنڈ پڑا اور ابا میاں سارا غصہ بھول بھال سینے سے لگا اسے اندر لے گئے۔

ابا میاں اسے یاد تھے، ابا میاں کی باتیں یاد تھیں، اگرچہ بکھری بکھری سی، انمل بے جوڑ انداز میں۔ چوڑا چکلا ڈھلتا ہوا جھریوں والا گورا گورا بدن، سفید ہلکی ہلکی ڈاڑھی، سر پہ سفید بال، کمر قدرے جھکی ہوئی، بر میں اجلا سفید ململ کا کرتا گلے میں لٹکی ہوئی چاندی کی ننھی سی تلوار جس سے دونوں وقت کھانے کے بعد خلال کرتے۔ حقہ پیتے پیتے اونگھنے

لگے ہیں۔ حقے کی نے ہونٹوں سے الگ کی، چاندنی بچھے تخت پہ سجے ہوئے گاؤ تکیے پہ
کمر نیچے کو کھسکی اور سفید برف سر ٹک گیا، خراٹے لینے لگے۔ ابھی خراٹے لے رہے ہیں
اور ابھی خراٹے لیتے لیتے چونکے ہیں اور ظہر کی نماز کے لیے سیدھے مسجد کو۔ محراب پہ
قرینے سے اوپر نیچے چنی ہوئی سرخ اور سرمئی چلمیں کہ بعض شوق سے خریدی گئی تھیں
اور بعض تحفے میں آئیں اور کسی پہ سنہری کسی پہ روپہلی باریک نفیس جالی کھدی ہوئی.
بھاری جھالر والا پنکھا کہ اونچی ڈاٹ والی چھت کے کندوں میں آویزاں دوپہری بھر
حرکت میں رہتا اور بیٹھک کے گوشے گوشے میں ہوا پہنچاتا، پیتل کا چمکتا ہوا اگالدان،
کونے میں رکھی ہوئی لام کی شکل کی چھڑی، لمبا چوڑا تخت کہ چاندنی اس پر بچھی تھی۔
چاندنی پہ قالین اور گاؤ تکیہ، ابا میاں سارا دن اسی تخت پر بیٹھے رہتے. آنے والے آتے.
مونڈھوں پہ بیٹھتے. حقہ پیتے، پان کھاتے، باتیں کرتے اور چلے جاتے۔ بیٹھک پھر خالی
رہ جاتی اور ابا میاں اونگھنے لگتے۔ ''ضمیر، تحسینہ کہاں ہو؟'' وہ اور تحسینہ دونوں بھاگے
بھاگے آتے اور ابا میاں سے لپٹ جاتے، روز اِکنی جو انھیں ملتی تھی مگر دوپہر کو ان کی
پکار گرفتاری کا پیام بن کر آتی ''باہر لو چل رہی ہے، سو جاؤ۔'' ایک بغل مین تحسینہ دوسری
بغل میں وہ، بیچ میں ابا میاں، انھوں نے خراٹے لینے شروع کیے اور تحسینہ نے
معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اس نے تحسینہ کو دھیرے سے اٹھے کہ اتنے میں خراٹوں
کا تسلسل ٹوٹا ''کہاں جاتے ہو، لیٹے رہو۔'' اور وہ دونوں پھر دم سادھ کر آنکھیں میچ کر لیٹ
جاتے، لیٹے رہتے لیٹے رہتے کہ اتنے میں گلی میں ملائی کے برف والا گھنٹی بجاتا، ملائی
کا برف کی صدا لگاتا آتا اور وہ بے اختیار ابا میاں کے پاس سے اٹھ لپکتے دوڑتے گلی
میں پہنچتے، اپنی اپنی اِکنی نیفے سے نکال، ملائی کا برف خریدتے۔ چاقو سے کٹی ہوئی سفید
برف قاشیں ہرے ہرے پتوں پہ جمتی چلی جاتیں اور پھر ان کی انگلیوں کے مس سے
پگھلتی چلی جاتیں۔ برف جب ختم ہو جاتا تو انگلیوں کا واسطہ ختم ہو جاتا اور برف سے سنے

پتے اور زبان میں بے واسطہ رشتہ پیدا ہو جاتا۔ پھر گیلی انگلیوں کو دامن سے پونچھتے اور ابا میاں کے خیال سے ڈرتے سہمتے ہولے ہولے اندر آتے۔ اتنے میں دالان کے کسی در سے بڑھیا آہستہ سے نکل کر رینگتی ہوئی اوپر اٹھتی نظر آئی "بڑیا" اور دونوں کے دونوں تیر کی طرح زینے کے راستے چھت پہ پہنچتے۔ تحسینہ بڑیا پکڑ لیتی اور منڈیر پر کھڑے ہو بڑیا کو چٹکی میں پکڑ فضا میں بلند کرتے ہوئے پیغام دیتی "بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا اسلام کہیو۔" "اور میرا بھی۔" وہ بے تابی سے بول اٹھتا۔

"تیرا کیوں، بڑیا میری ہے۔ بڑیا بڑیا اللہ میاں سے تحسینہ کا سلام کہیو" اور چٹکی کھلتی، اور بڑیا، سفید گالا جھالا، ہوا کے جھونکے کے ساتھ اوپر اٹھتی اور اونچی چلی جاتی، وہ روہانسا ہو جاتا اور تحسین سے اس کا دل پھر جاتا۔ اداس اداس ساری چھت پہ بھٹکتا پھرتا۔ کبھی اس منڈیر کے پاس کبھی اس ممٹی کے قریب، کبھی سوکھی مرنڈ گھاس والے بوسیدہ چھجے پہ کبھی اس بڑے کھرے پہ جس کے راستے برسات کے دنوں میں چھت کا سارا پانی سمٹ کر دیوار سے نکلے ہوئے ٹین کے ٹوٹے پت نالے میں جاتا اور دھاڑ دھاڑ گلی میں گرتا۔ پھر مایوس ہو کر وہ نیچے اترنے لگتا۔ اتنے میں بندروں کے طفیل ٹوٹی ہوئی ممٹی میں ایک ننھی سی بڑیا دبکی نظر آتی "بڑیا مل گئی۔" وہ زور سے چلاتا۔ پھر وہ بھی اسی منڈیر پہ کھڑا ہو پیغام دیتا "بڑیا میرا اسلام اللہ میاں سے کہیو۔" تحسینہ کس حسرت سے بڑیا کو دیکھتی، بڑیا کہ اس کی چٹکی سے نکل دھوپ سے تپتی فضا میں تیرنے لگتی، رینگتی رہتی اور تحسینہ لہک کر کہتی، تیری بڑیا تھکی ہوئی ہے۔ اللہ میاں کے پاس کیسے پہنچے گی۔ لو جی وہ تو نیچے آرہی ہے۔" وہ پھر روہانسا ہو جاتا کہ اتنے میں ہوا کا ایک زور کا جھونکا آتا اور بڑیا نیچے آتے آتے اٹھتی اور تیزی سے بلندیوں پہ بہتی چلی جاتی۔ اللہ میاں کو سلام لے جانے کے سوال پہ ان میں ہمیشہ لڑائی ہوئی، بڑھیا تو ایک ہی کا سلام لے جا سکتی تھی نا، اور تحسینہ ایسی مطلبی کہ بس اپنا سلام اللہ میاں کو بھیجتی۔ ہاں سینگی بائی کی جادو بھری

آواز دور سے آتی تو دل ان کے ساتھ ساتھ دھڑکتے اور سہمی آنکھیں آپس میں ایک ہی کہانی کہتیں۔ مارے ڈر کے، نیچے منڈیر کے، دیوار سے زینے کی لگے، دبکے بیٹھے رہتے اور اتنے پاس پاس ہو جاتے کہ دھڑکن ایک دوسرے کے دل کی صاف سنائی دیتی بیٹھے رہتے۔ پھر چپکے چپکے سر نکال کر گلی میں جھانکتے کہ سینگی بائی ہے یا چلی گئی۔ "بڑیا" گلی میں بھٹکتی ہوئی بڑیا کو دیکھ کے یکبارگی چونکنا اور سینگی بائی کو بھول بھال موافق تیر کے زن سے زینے سے نکل آنگن میں، آنگن سے گلی میں، پر بڑیا غائب کہاں گئی، چھو ہوگئی اور وہ بڑیوں کی تلاش میں ایک لمبے اور خطرناک سفر پہ چل کھڑے ہوتے، بھونڑ کی طرف، جہاں آکھ کے پودے کھڑے تھے کہ ان کے ہرے کچے کچے پھلوں کو توڑنے پہ سفید سفید دودھ نکلتا اور جب پک کر آپ ہی آپ چٹختے تو اندر ان کے باریک سفید ریشم کے تار سے تنے ہوتے۔ چٹیل میدان کہ چلتے چلتے کوئی شیشہ تلوے سے چبھ جاتا اور خون نکلنے لگتا یا گوکھرو چبھ جاتے اور نکالے نہ نکلتے۔ کہیں بدرنگ کانٹے دار جھاڑی، کوئی اڑا اتر چھا اکیلا ببول کا پیڑ، کالی چتی دار سرخ دانوں والی جھاڑیاں اور پرے ان کے ایک طرف کھنڈال کا ایک ہرا بھرا پیڑ ایک اونچا پیپل اور کئی ایک گھنے نیم اتنے گھتے ہوئے کہ نیچے ان کے دھوپ کا نشان تک نہ ہوتا۔ ان درختوں کے قریب پہنچنے پر سفر کی منزل اکثر بدل جاتی اور بڑیوں سے ذہن گرگٹ کی طرف منتقل ہو جاتا۔ ان درختوں میں جانے کتنے گرگٹ چھپے تھے کہ دوپہری میں روز ایک آدھ گرگٹ کا بھرتا ہوتا اور دوسرے دن آتے تو پھر نیم کے کسی گدے پر کھنڈال کی کسی ٹہنی میں کبھی سرخ سرخ منھ نظر آتا کبھی پیلی پیلی لمبی دم۔ کھنڈال کی لمبی لچکیلی ہری سینٹوں سے اور اینٹوں سے گرگٹ کو مار کے حضرت عباس کی مشک میں چھید کرنے کا بدلہ لینا اور ایک ایک پل خون بڑھانا اور پھر اس سے پرے چلتے ہوئے کنوئیں پہ ہاتھ منھ دھونا چلو بھر بھر پانی پینا اور کنڈی کے ٹھنڈے موتیا پانی میں پیر ڈال دینا۔ پانی سے لبالب بھری

ہوئی کالی چرس جب کنارے پہ آجاتی تو گوراچٹا کڑیل جوان ہیرا رسے کو زور سے کھینچتا اور تان لگاتا ع

ہو جی گنگا جمنا سرسوتی سات سندھو بھرپور

اور اس کے قدموں میں ان گنت ٹھنڈے اجلے بہتے پھول بکھر جاتے۔ کالے گھٹنوں سے اونچی میلی دھوتی اور ہونٹوں سے نیچے لٹکتی ہوئی گچھاسی کھچڑی مونچھوں والا گندل بیلوں کا رسہ کھولتا، ''تیرا بیل کا منہ ہو۔'' اور اس کے ساتھ ہنٹر پڑنے کی سڑاک سی آواز جس کے اثر سے اڑے ہوئے بیل پھر اونچائی کی طرف چل پڑتے اور اس تیزی سے کھر مارتے خاک اڑاتے کہ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا کہ اب وہ اپنے رستے سے ہٹے اور اس کے سر پر آئے۔ وہاں سے ہٹ کر پھر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف ہولیتے۔ پھر وہی معرکہ، گرگٹ۔۔۔۔ گرگٹ سے وہ ڈرتا بھی تھا اور دکھائی دے جاتا تو مارے بغیر چھوڑتا بھی نہیں تھا، پلی بھر خون جوگھٹ جاتا۔ ہاں ایک دفعہ وہ گرگٹ کو نہیں مار سکا تھا، بس ایک دفعہ، مارنا کیا معنی ہاتھ ہی نہیں اٹھا۔

''گرگٹ'' اس کی آستین پہ تحسینہ کی گرفت سخت ہوگئی اور دونوں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ پیپل کی جڑ سے نکل کے وہ تنے پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے اینٹ اٹھائی، اینٹ اٹھائی تھی کہ وہ چڑھتے چڑھتے ایک دم سے رک گیا، منہ اس کا تنے سے کوئی ایک انگل اونچا اٹھ گیا اور سرخ ہوتے انگارے کی مانند دہکنے لگا۔ سرخی اس کی گردن میں، اس کی پیٹھ میں لہریں لینے لگی اور پھول کے وہ پہلے سے دگنا موٹا ہوگیا۔ تحسینہ کی مٹھی نے اس کی آستین کے ساتھ ساتھ اس کا بازو بھی انگلیوں میں جکڑ لیا۔ دونوں دل ایک آہنگ ایک رفتار سے دھڑکنے لگے۔ دونوں ایک بن گئے۔ اکیلے، کوسوں آدمی نہ آدم زاد، نہ آدم زاد کی آواز۔ پانی کی بھری چرس کنوئیں میں معلق اور بیل ڈھلان پہ اترتے اترتے جیسے دفعتاً رک گئے ہوں اور ہیرا اور گندل کنواں چھوڑ کر کہیں گم ہو گئے ہوں۔ ہر چیز ہر

آواز ٹھہر گئی تھی۔ قدم ان کے، دھڑکتے ہوئے دل ان کے، ہاتھ میں اٹھائی ہوئی اینٹ، پیپل کے گدے کھنڈال کی لمبی لچکیلی شاخیں۔ ایک چیز بس حرکت میں تھی، حرکت میں تھی، لہرا رہی تھی، سرخی کہ اب بل کھا کے ہری پڑتی جارہی تھی، امنڈتی بل کھاتی ہری لہر، گرگٹ جانو گوم ہوگیا تھا یا گھل کر رنگ کی لہر بن گیا تھا، پیچ کھاتی گرم ہوتی ہری لہر، لہر پھر بدلی، رنگ نے تیسری جون لی، ہری لہر نیلی پڑنے لگی۔ پھر گنتی کا احساس بھی جاتا رہا، کچھ خبر نہ تھی کہ کب کے کھڑے ہیں کب تک کھڑے رہیں، رنگ کون کون سی جون لے چکا ہے اور کون سی جون اور لے گا۔

چونکے تو پیپل کے پتوں میں ایک لمبی پیلی دم گھومتی ہوئی گم ہو رہی تھی۔ دم میں دم آیا اور دل پھر حرکت کرنے لگے، دھڑکنے لگے اور پسینے کی تلی چلنے لگی۔ قدم جو جم گئے تھے اب آپ ہی آپ کنوئیں کی طرف اٹھنے لگے، جہاں چرس اپنے معمول سے چل رہی تھی اور ٹھنڈا نکھرے ہوئے موتیوں جیسا پانی ہیرا کے سفید پیروں پہ بہتا ہوا پختہ کنڈی میں، پختہ کنڈی سے کچی نالی میں اور نالی سے کھیتوں میں جا رہا تھا۔ خاموشی سے پانی پیا اور جلدی سے گھر کی طرف چل پڑے، چپ چاپ، گم سم، دہشت آنکھوں میں باقی تھی اور دھڑکنا دلوں نے ابھی بند نہیں کیا تھا، ہوا بند، اور مکوہ اور آکھ کی جھاڑیاں کہ جیسے دھوپ میں پگھلنے لگی ہیں۔ زمین نے قدم ایک دم سے پھر پکڑ لئے۔ چار قدم آگے ایک چکر تیزی سے گھومنے لگا تھا۔ ''چڑیل'' تحسینہ نے آستین اس کی پھر جکڑ لی۔ چکر تیزی سے گھومتا گھومتا پھیلنے لگا اور آس پاس پڑے ہوئے کاغذ، پتنگوں کی ٹوٹی کمانیاں، مرغیوں اور کبوتروں کے اکا دکا میلے پر، چھوٹی چھوٹی کنکریاں اپنی لپیٹ میں لیتا آگے بڑھنے لگا، پیچ کھاتا اوپر اٹھنے لگا۔

واپس گھر پہنچے تو بڑی آپا نے آڑے ہاتھوں لیا ''کہاں گئے تھے تم؟ ذرا صورت دیکھو، منہ سرخ ہو رہا ہے۔ ڈوبے لوؤں میں مارے مارے پھرے ہیں۔''

بڑی آپا چلاتی رہیں اور وہ دونوں کے دونوں چپ. بڑی آپا کہنے کو پھوپھی، اصل میں ماں سے زیادہ۔ تحسینہ بیٹی تھی، پر بیٹی سے زیادہ اسے چاہتی تھیں۔ نہلانا دھلانا، رات کو پاس سلانا، باوا جب اسے ساتھ لے جانے لگے تو روٹھیں، خفا ہوئیں، منتیں کیں، امی کو برا بھلا کہا، پھر کچھ نہ چلی تو روئیں، باوا بات کے ایسے پکے نکلے کہ نہ ابا میاں کی بات پہ دھیان دیا نہ بڑی آپا کے تانسنے پہ پسیجے۔

"ہاں بھیا، تمھاری اولاد ہے تمھیں اختیار ہے، بیوی نے کہا ہوگا کہ لونڈا پھوپھی کے پاس رہ کر بگڑ جاوے گا. لے کے آؤ۔ ہاں بھیا شوق سے لے جاؤ۔ ہم کون ہیں روکنے والے۔"

بڑی آپا تانستی رہیں، باوا سنتے رہے، مگر ارادے میں ذرا فرق نہ آیا۔ باوا کرتے وہی تھے جو جی میں آتی تھی مگر سنتے تھے خاموشی سے۔ ابا میاں کے سامنے تو بالکل ہی چپ رہتے۔ انھیں دنوں کی ایک تصویر اب تک حافظہ میں اس کے محفوظ تھی۔ صبح ہی صبح بیٹھک میں لوگ جمع تھے اور ابا میاں کی آواز بار بار غصے سے کانپنے لگتی اور منہ سرخ پڑ جاتا۔ اتنی سویرے لوگوں کا بیٹھک میں جمع ہونا بھی عجیب سا تھا کیونکہ ابا میاں اتنی سویرے نہ تو بیٹھک کھولتے تھے اور نہ ملنے والے آتے تھے ہوا رات سے بند تھی۔ رات کو گرمی سے کئی مرتبہ اس کی آنکھ کھلی اور دیکھا کہ بڑی آپا جاگتی ہیں اور پنکھا جھلتی ہیں۔ صبح پھر بہت سویرے گرمی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ سارا آنگن پیلا پیلا ہو رہا تھا۔ ایک غبار دیواروں پہ منڈیروں پہ، چھت پہ نیم کے اوپر غرض سب جگہ تیر رہا تھا، تیرتے تیرتے رک گیا تھا۔ بڑی آپا نماز کی چوکی پہ تھیں اور اپنی میٹھی دکھ بھری آواز میں مناجات پڑھ رہی تھیں ع

مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی

صبح کی نماز کے بعد یہ مناجات بڑی آپا کا ورد تھا۔ روز یہی ہوتا کہ آنکھیں اس کی

ابھی بند ہیں اور آدھے سوئے اور آدھے جاگتے کی کیفیت ہے اور کانوں میں چاندی کی کٹوریاں سی بج رہی ہیں ؎

مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی

بڑی آپا کی آواز میں عجب رقت اور درد کی کیفیت تھی اور مناجات پڑھتے دیکھ کر لگتا کہ بس پگھلیں گی اور صبح کے پاکیزہ دھندلکے میں گھل جائیں گی۔ پیلا پیلا آنگن، ہوا بند، اور بڑی آپا کی رقت بھری میٹھی آواز، ایک ٹھنڈی منور لکیر آنگن کی تپلی گرم فضا میں رستہ بناتی ہوئی۔ اس کی آنکھیں پھر مندنے لگیں۔ لیکن بند ہوا سونے کہاں دیتی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا، بڑی آپا مناجات پڑھتی تھیں، تائی اماں وضو کر رہی تھیں، تحسینہ بے سدھ پڑی خراٹے لے رہی تھی اور بیٹھک سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے اسے اکتاہٹ ہوئی۔ آنکھیں ملتا چارپائی سے اترا اور سیدھا بیٹھک میں۔

''سن رہے ہو، بنیاد علی، پیر جی کی باتیں۔'' ابا میاں زور زور سے بول رہے تھے۔

''اماں پیر جی تم مجھے جھوٹا ڈال سکتے ہو مگر اخبار کو کیا کرو گے۔ فائل نکلواؤں اور دکھاؤں آپ کو اخبار۔''

اخبار کے ذکر پر پیر جی تھوڑے سے سٹپٹائے اور بنیاد علی پہ ابا میاں کی بات کا سکہ جم گیا۔

ابا میاں اور تیز ہوئے۔

''یہ انتہا تھوڑا ہی ہے اور سنئے۔'' ابا میاں رکے اور پیر جی سے آواز اونچی کر کے بولے ''پیر جی اور سنئے، حضور رسول مقبول کے روضے کا بھی قبہ گروا دیا۔''

''قبہ گروا دیا۔'' بنیاد علی، مولوی ثناء اللہ شیخ ضیاء الحق سب کے بدن میں رعشہ آگیا

''نہیں صاحب، خیال میں آنے والی بات نہیں۔''

''نہیں صاحب'' ابا میاں گرجے ''تو اخبار تو مان لو کہ جھوٹا ہوا نا؟''

سب کے سب چپ ہو گئے۔

پیر جی بولے" گروایا تو نہیں ہے اتروا کے الگ رکھ دیا ہے۔"

ابا میاں بولے" تو ہوا کیا کہ عین دو پہر میں ایک بدلی اٹھی، سارا مدینہ خشک اور روضہ منورہ پہ چھم چھم برسا کہ گنبد شریف اور صحن اقدس دھل کے گرد سے پاک ہو گئے۔"

عقیدت سے سب کے سر جھک گئے۔ پیر جی خاموش، مولوی ثناء اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ باوا الگ مونڈھے پہ چپ چاپ بیٹھے تھے وہ کل ہی چھٹی پر آئے تھے۔ بیچ میں موجود لیکن کسی بات کی حمایت نہ مخالفت اور نہ چہرے پہ غصہ نہ عقیدت، اپنی اپنی عادت۔ باوا ابا میاں کے برعکس تھے۔

ابا میاں حقہ پیتے رہے، پھر حقے کو بنیاد علی کی طرف سرکا دیا۔" شیخ جی تم مفصلی کرو۔"

وہ پھر بولے" ایسا شخص مسلمان کہلانے کا مستحق ہے؟"

شیخ ضیاء الحق فوراً بولے" توبہ کرو، ایسا شخص اور مسلمان۔"

"ایسا شخص مسلمان تو نہ ہوا نا؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔"

"اور جو ایسے شخص کی حمایت کرے وہ مسلمان ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو اب سنو۔" ابا میاں بولے" تمہارے حضرت رئیس الاحرار نے اسی ابن مسعود کی حمایت کی تھی۔"

"ابن سعود کی کی؟"

"واللہ ابن سعود کی۔ جو جھوٹ بولتا ہو وہ کافر، اخبار موجود ہے۔ اس میں ان کے قلم کی تحریر دی ہوئی ہے۔"

پیر جی پھر بولے" رئیس الاحرار کی دلیل یہ تھی۔۔۔۔"

اب مولوی ثناء اللہ بولے "یہ تو مذہب کی بات ہوئی۔ سیاست کی بارے میں جو ان کی رائے تھی اس پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔"

"لیجیے صاحب" ابا میاں طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بنیاد علی کی طرف مخاطب ہوئے "بنیاد علی سنتے ہو کیا کہہ رہے ہیں شیخ جی۔۔۔ اماں شیخ جی آپ ہیں کانگریسی۔ میرا تو روئے سخن ان چار مسلمانوں کی طرف ہے۔"

بنیاد علی نے حقہ پھر ابا میاں کی طرف بڑھا دیا۔ ابا میاں نے حقے کے نے ہونٹوں میں لی۔

دو تین گھونٹ لئے۔ کھانسنا شروع کر دیا۔ پھر گھونٹ لیے اور آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"خیر جیسا کیا وہ ان کے ساتھ۔ اب وہ اس دنیا سے اٹھ گئے۔ اللہ ان کے گناہوں کو معاف کرے۔" بنیاد علی ٹھنڈا سانس بھر کے بولے۔

ابا میاں کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں اور حقہ بدستور گڑ گڑ کر رہا تھا۔

"ویسے یہ خبر صحیح بھی ہے؟" مولوی ثناء اللہ نے شک بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"صاحب سنا ہے اللہ جانے۔" بنیاد علی نے جواب دیا۔

"اخبار میں تو ابھی کچھ آیا نہیں ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔" پیر جی بولے۔

ابا میاں کھنکارے حقے کی نے کو الگ کیا۔ کہنے لگے "آج کی خبر ہے تو اخبار یاں کل پہنچے گا۔" انھوں نے حقے کی نے پھر منھ میں لے لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"خدا کرے جھوٹ ہو۔" شیخ ضیاء الحق بولے۔ باہر سڑک پہ اک دبا دبا سا ہنگامہ پیدا ہوا اور بہت سے قدموں کی مدھم چاپ۔

"کیوں بھئی کیسا جلوس ہے یہ؟" ایک شخص چلتے چلتے بیچ سڑک پہ ٹھٹک گیا۔

"جلوس؟" بیٹھک میں سب کے سب چونک پڑے۔ جلوس چلتے چلتے بیٹھک کے

سامنے آ گیا۔ کالا علم آگے آگے، پیچھے ایک مجمع، کھدر پوش کانگریسی رضا کار، ترکی ٹوپی اور شیروانیاں پہنے ہوئے مسلمان شرفا، شیخ ضیاء الحق، پیر جی، بنیاد علی، مولوی ثناء اللہ سب کے سب اندر سے باہر چبوترے پہ آئے، پھر نیچے اتر کے جلوس میں شامل ہو گئے۔

ابا میاں آہستہ سے اٹھے اور چبوترے پہ آ کھڑے ہوئے۔ باوا ان کے پیچھے پیچھے۔ جلوس جب بیٹھک کے آگے سے گزر گیا تو ابا میاں کے قدم شاید بے ارادہ اٹھے اور آہستہ سے نیچے اتر کر وہ بھی جلوس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ باوا ان کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے ساتھ لگ لیا تھا۔

فقیر چند پر چونیا سودا تولتے تولتے دکان سے اٹھا اور نیچے آ کھڑا ہوا "میاں کیا ہوا؟"

"مولانا محمد۔۔۔۔"

"محمد علی شوکت علی؟"

"ہاں محمد علی شوکت علی۔ لالہ جی دکان بند کر دو۔"

"لالہ جی، کیا ہوا، گھٹنا ہو گئی؟"

"ہمبے محمد علی شوکت علی کا دیہانت ہو گیا۔" فقیر چند نے دکان کو تالا لگایا اور لپک جھپک آگے بڑھ جلوس میں مل گیا۔

"محمد علی شوکت علی خلافت والے؟"

"کیا کہا؟ خلافت والے محمد علی شوکت علی گزر گئے؟"

دکانیں بند ہونے لگیں۔ کسی نے دکان بند کر تھڑے پہ بیٹھ جانا مناسب جانا، کوئی جلوس میں جا ملا۔ خاموش جلوس سڑکوں اور گلیوں سے نکلتا ہوا ٹھیٹھر وں والی گلی میں پہنچا، وہاں سے نکل کر بڑے بازار میں بازار سے پینٹھ کے میدان میں آیا اور رک گیا۔

"حضرات بیٹھ جائیے۔" ایک شخص بلند آواز سے بولا اور مجمع بڑی خاموشی سے میدان میں بچھے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر صمد آگے بڑھا اور چادر بچھے ہوئے تخت پہ جا

پہنچا، کانگریس کے ہر جلوس میں صمد کھدر کا لمبا کرتہ پہنے عینک لگائے بڑھائے آگے آگے ہوتا تھا۔ کبھی کبھار کئی مہینوں کے لیے غائب ہو جاتا اور جلوس میں بالکل دکھائی نہ دیتا، پتہ چلتا کہ جیل چلا گیا اور پھر کسی دن یکا یک جلوس میں سب سے آگے جھنڈا لیے نظر آتا اور زور زور سے نعرے لگاتا، گلا پھاڑ کے تقریر کرتا۔ آج اس نے کوئی نعرہ نہیں لگایا تھا۔ وہ تخت پہ کھڑا ہوا۔ مجمع خاموش تھا۔ چند لمحے وہ چپ کھڑا رہا، پھر بلند آواز سے بولا ''بھائیو، ہم وطنو، آج رئیس الاحرار۔۔۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ چپ ہوا۔ گلا صاف کیا، پھر بولا ''بھائیو، آج۔۔۔'' آواز پھر بھرانے لگی، پھر خاموش ہو گیا۔ مجمع بدستور خاموش تھا۔ بہت سے لوگ اس کی طرف تک رہے تھے۔ بہت سوں کے سر جھک گئے تھے۔ بعض لوگوں نے چپکے چپکے رونا شروع کر دیا تھا۔ ایک شخص نے پانی کا گلاس صمد کو پکڑا دیا۔ صمد نے پانی پیا، رومال سے منھ پونچھا، پھر اعتماد سے کھنکار کر بولا ''ہم وطنو! رئیس الاحرار نے فرمایا تھا کہ میں آزادی لیے بغیر اپنے ملک واپس نہیں جاؤں گا۔'' صمد چپ ہوا، پھر ایک ساتھ رقت بھری آواز میں چلا کر بولا ''تو مسلمانو رئیس الاحرار واپس نہیں آئے، وہ ہمیں۔۔۔ ہمیں وہ چھوڑ گئے۔'' صمد کی آواز بھرا گئی اور وہ اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔

مجمع اسی طرح جما بیٹھا تھا، خاموش، سر جھکے ہوئے، کسی کسی آنکھ سے آنسو بہتے ہوئے، اس نے ابا میاں کو دیکھا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ باوا چپ کھڑے تھے۔

(۲)

ماضی اس کے تئیں خوشبو تھی کہ اڑ رہی تھی، ہجرت کر رہی تھی۔ لمبی راتوں اور کھڑی دو پہریوں کا وہ بے اَنت سلسلہ اب ایک ادھ بسرا خواب تھا۔ آنگن والا نیم کا پیڑ، اونچی نیچی لمبی چوڑی چھتیں، کاہی جمی منڈیریں اور اونچی دیواریں، سب سے اونچے کوٹھے والی وہ منڈیر جسے بندروں نے آدھا توڑ ڈالا تھا، پرے نظر آتا ہوا لال مندر، لال مندر سے بہت پرے کھڑا ہوا موٹا مٹھس پیچ۔ بیچ بیچ میں نیم اور پیپل اور شیشم کے درخت کھڑے ہوئے۔ سب چیزیں ویسی ہی ہوتے ہوئے ویسی ہی نہیں تھیں۔ اس سے وہ سب کی سب کتنی دور ہوگئی تھیں۔ لگتا تھا کہ دوسرے جنم میں ان سے مل رہا ہے۔ سالوں بعد وہ واپس آیا تھا۔ کیا خبر ہے کہ ابھی اور کب تک وہ واپس نہ آتا۔ مگر ابا میاں کی بیماری کا تار پہنچا اور باوا نے جلدی جلدی چھٹی لی۔ امی نے سفر کا سامان تیار کیا اور چل کھڑے ہوئے۔ مگر سفر گھنٹوں کا تو نہیں تھا، دنوں کا تھا۔ صوبے سے صوبے میں یوں تو نہیں پہنچ جاتے۔ گاڑی دن بھر چلتی۔ رات بھر چلتی۔ چلتے چلتے کھڑی ہو جاتی، پھر چلنے لگتی۔ رات کے اندھیرے میں کبھی کسی اسٹیشن کے قریب کبھی بیچ جنگل میں کھڑی ہو جاتی اور سیٹی دینے لگتی۔ کبھی کبھی اتنی دیر کھڑی ہوتی کہ مسافر اکتا کر گاڑی کے نیچے اتر

پڑتے اور ٹولیوں کی ٹولیاں پٹریوں کے بیچ میں بچھے کنکروں کو روندتی ہوئی چہل قدمی کرنے لگتیں۔ باوا پہلو بدلتے، کھڑکی سے جھانک کے دیکھتے اور بالآخر نیچے اتر کر کسی چیکر سے پوچھ گچھ کرنے لگتے کہ اتنے میں دو پٹری پہ روشنی کا ایک ہنڈا دکھائی دیتا جو قریب آنے پر اتنا تیز ہوتا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔ مگر جب مسافروں سے بھرے ہوئے روشن ڈبے ساکن ڈبوں کے برابر سے تیزی سے گزرتے ہوئے اندھیرے میں کھو جاتے تو وہ شور بھی دور ہوتا، گم ہوتا چلا جاتا، رکی ہوئی گاڑی میں جھٹکا لگتا، سارے ڈبے ہل اٹھتے، گاڑی پھر چل پڑتی۔

سفر میں امی نے کئی بار اپنی الٹی آنکھ کے پھڑکنے کا ذکر بڑی فکرمندی سے کیا۔ سفر کے تیسرے دن صبح کو انھوں نے چلتی گاڑی سے سامنے کچے راستے پہ ایک بیل کو مرا پڑا دیکھا۔ بے ساختہ منھ سے نکلا "الٰہی خیر!" پھر گاڑی رک کے کھڑی ہو گئی۔ بس اس کے بعد تو ان کا سارا سفر ہی تشویش میں کٹا۔

باوا نے چلنے میں بہت جلدی کی تھی مگر ابا میاں نے ان سے زیادہ جلدی کی۔ پہنچے ہیں تو تیجا تک ہو چکا تھا۔ بڑی آپا باوا سے مل کے بہت روئیں، روئیں، بین کیے اور بین میں ابا میاں کی طرف سے شکایتیں کیں کہ مرتے وقت باپ کو پانی نہیں پلایا۔ کبھی شکایت، کبھی طعنہ، کبھی ابا میاں کے انتظار کا ذکر، کبھی اپنی گھبراہٹ کا تذکرہ۔

"آخری وقت تک دروازے پہ ٹکٹکی بندھی رہی۔ اب آؤ، اب آؤ۔ بار بار پوچھتے، چھموں گاڑی دیکھنے کسی کو بھیجا ہے۔ بڑی حسرت تھی کہ بیٹے کی صورت دیکھ لیں۔" بڑی آپا کی آواز پھر بھرا گئی اور باوا کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔ رات کو جب وہ آ کر اترے ہیں تو تڑکا ہو رہا تھا۔ بڑی آپا باوا کے گلے میں باہیں ڈال کے اور امی کے سر سے سر جوڑ کے جانے کب تک روتی رہیں۔ اس کی تو چارپائی سے کمر لگتے ہی پٹ سے آنکھ لگ گئی تھی۔ اب صبح اٹھنے پہ اسے لگا کہ رات کا وہ سلسلہ اب تک جاری ہے، ہاں اب اک ٹھہراؤ

کے ساتھ۔ بڑی آپا روتے روتے چپ ہو جاتیں، باتیں کرنے لگتیں، ان کے ہاتھ میں سروطہ چلنے لگتا۔ پھر جانے کیا ہوتا کہ انھیں ابا میاں کی کوئی بات یاد آجاتی، آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں، آواز رندھ جاتی اور قدرے اونچی آواز سے رونا شروع کر دیتیں۔ باوا چپ تھے، ہاں بار بار آنکھ ضرور نم ہو جاتی تھی، سر جھک جاتا تھا۔ آخری وقت میں ابا میاں کی صورت نہ دیکھنے اور خدمت نہ کرنے کا غم، پھر بڑی آپا کے بین بھرے طعنے، باوا کا سر جھک جاتا اور جیب سے رومال نکل کر آنکھوں پہ پہنچ جاتا۔ بڑی آپا کی آنکھوں کی طرح ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تو نہیں تھیں مگر سرخ پڑ گئی تھیں۔

"بس ایک تمنا رہ گئی بی بی کہ بیٹا جنازے کو کاندھا دے باقی تو خدا بخشے اللہ نے ساری تمنائیں پوری کیں۔" تائی اماں کے لہجے میں تاسف کی کیفیت کے ساتھ ساتھ دلاسا دینے کا انداز بھی تھا۔

"اللہ، اولاد کو سب کچھ قابل بنا کے دنیا سے اٹھے۔ ایسی سکھ کی نیند اللہ ہر کسی کو نصیب کرے۔" تائی اماں کو جانے کیا دھیان آیا کہ بولتے بولتے چپ ہو گئیں۔ ان کی آنکھیں خلا میں گھورنے لگتی تھیں۔ چپ بیٹھے بیٹھے آہستہ سے چونکیں، بولیں، بی بی بالکل ایسا لگے تھا کہ سو رہے ہیں۔ جانو ابھی آنکھ لگی ہے اور ذرا کھٹکا ہوا تو چونک کے آنکھ کھول دیں گے۔"

بڑی آپا تائی اماں کا منھ تکنے لگیں۔ پھر کہیں اور جا پہنچیں۔ "پوچھنے لگے کیا دن ہے۔ میں بولی جمعرات، پائنتی پہ تحسینہ بیٹھی تھی، اسے تکنے لگے، بولے نادعلی پڑھو میں نادعلی پڑھنے لگی۔۔۔ ایک ساتھ آنکھیں کھول دیں اور دروازے کو تکنے لگے۔۔۔ جیسے کوئی دروازے پہ کھڑا ہو۔۔۔ کہنے لگے چھموں۔۔۔ مولا آئے ہیں۔۔۔ پھر آنکھیں مندتی چلی گئیں۔۔۔۔"

سب چپ، اپنی اپنی جگہ بت بنے ہوئے کسی دھیان میں ڈوبے ہوئے۔ وہ پھر

بڑی آپا کو تکنے لگا تھا جن کی آواز اب کی بار خلاف معمول بالکل نہیں بھرائی تھی۔

''آخری وقت میں مولا مشکل کشا آوے ہیں۔'' تائی اماں کی دھیان میں ڈوبی ہوئی آواز سرگوشی جیسی کیفیت کے ساتھ ابھری اور ڈوب گئی۔ پھر وہی چپ۔ آنگن کی ہر چیز ساکت تھی، دھوپ بھی کہ نیم کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی کی پائنتی پر آ کر رک گئی تھی۔ نیم کی کسی خاموش ٹہنی سے کوئی ننھا سا زردی مائل سفید پھول جھڑتا اور آہستہ سے کسی گود میں، کسی شانے پہ، کسی سر میں آپڑتا۔ ننھے ننھے زردی مائل سفید پھول خاموشی سے جھڑ رہے تھے اور بکھر رہے تھے۔ بڑی آپا کے گھٹنے پر رکھے ہوئے سوکھے سر میں، تائی اماں کے سفید برف بالوں میں اور امی کی کھچڑی چٹیا میں، پاندان پہ، چارپائی پہ، چارپائی کے برابر بنی ہوئی گھڑونچی اور اس پہ رکھے ہوئے کورے سرخ گھڑوں پر۔

جانے کیسے مگر پھر وہی ذکر چل نکلا، مگر اس مرتبہ سرگوشیوں میں تائی اماں کی آواز اتنی آہستہ ہوتی کہ اسے کچھ سنائی نہ دیتا کہ کیا کہہ رہی ہیں، بس ہونٹ ہلتے اور ڈلا سی آنکھیں حیرت سے گردش کرتی اور باتیں کرتی دکھائی دیتیں اور بڑی آپا کے ہاتھ میں چلتا ہوا سروطہ یکبارگی رک جاتا۔

''اچھی بڑی آپا میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔'' امی کی آواز سرگوشی کی حد سے نکل کر ذرا بلند ہو چلی تھی۔ ''میں نے تمہارے بھائی سے کہا۔ انھوں نے جھڑک دیا کہ تمھارا وسوسہ ہے۔ آبادی قریب ہے، کسی کسان کا بیل ہوگا، مر گیا۔ مگر آپا میرا دل اندر سے دھکڑ پکڑ کرے کہ یا اللہ گاڑی بیچ جنگل میں کیوں رکی اور آس پاس کوئی کھیت نہیں، کوئی گاؤں نہیں، بیل کس کا ہے۔''

''اری بہنوں!'' بڑی آپا کے لہجے میں آواز بلند ہوتے ہوئے بھی سرگوشی کیفیت تھی اور آنکھوں میں حیرانی۔ ''میں نے تو بہنوں، تین دن پہلے خواب دیکھ لیا تھا۔ کیا دیکھوں ہوں کہ ابا میاں ہیں، آواز دے رہے ہیں، چھموں چھموں، میں دالان سے نکلی

ہوں۔ پشت ان کی میری طرف، باہر دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں بولی ہوں کہ ابا میاں اس لُو میں آپ کہاں جا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں "بی بی، لو کہاں، دن ڈھل رہا ہے۔ اذان ہو رہی ہے، نماز کو جاتا ہوں، دروازہ اندر سے بند کرلو۔"

پھر سب کے سب چپ تھے۔ اسی طرح اپنی اپنی جگہ بت بنے ہوئے۔ کسی دور کے دھیان میں ڈوبے ہوئے۔ نیم کی ٹہنیاں کہ دم بھر پہلے ہوا سے لہرا رہی تھیں اب سرنگوں ہو گئی تھیں اور ننھے زردی مائل سفید پھولوں کے گرنے کی رفتار پھر اتنی سست پڑ گئی کہ جانو فضا میں رینگتے ہوئے نیچے آ رہے ہیں۔

تائی اماں کو حرکت ہوئی "توبہ توبہ بڑی گرمی ہے۔ ہوا بالکل رک گئی۔" اور انھوں نے زور زور سے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔

بڑی آپا چونکیں۔ انھیں یاد آیا کہ باوا کو نہانا ہے "تحسینہ، اری تحسینہ، بی بی ذرا غسل خانے میں تولیہ صابن رکھ دے اور دیکھ کہ کسلے میں پانی ہے؟"

بری آپا کو باتیں کرتے کرتے کسی بھی بات پر ابا میاں یاد آ جاتے، ان کی بات کا خیال آ جاتا، آنکھ بھر آتی۔ شروع میں یہ لمحے جلدی جلدی آتے، پھر وقفے لمبے ہونے لگے۔ لمحے دیر سے آتے اور جلدی رخصت ہو جاتے۔ سوگ کی فضا حویلی سے رخصت ہو چلی تھی اور روز مرہ کے ذکر اذکار شروع تھے۔ ابا میاں کی یاد کم ہونے لگی اور بڑی آپا کی توجہ کا مرکز باوا بننے لگے۔ پھر امی تھیں کہ بہت دنوں کے بعد ملی تھیں اور سینکڑوں ذکر ان سے کرنے کے تھے، ضروری بھی اور غیر ضروری بھی۔ پھر وہ اسے دیکھتیں اور انھیں خیال آتا کہ شادی اس کی کب ہوگی۔

"ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے اور اب تعلیم سے فراغت ہو گئی سمجھو۔ بہو تم اس کا بیاہ کر دو۔"

امی جواب دیتیں "بڑی آپا تمھارے بھائی کہتے ہیں کہ ہم لونڈے کی منشاء کے بغیر شادی نہیں کریں گے۔ نئی روشنی کے لونڈے ہیں، ماں باپوں کی پسند سے ان کی پسند نہیں ملتی۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ بھئی خود پسند کرلیں، ہم شادی کردیں گے۔"

"کیوں ضمیر بیٹا تمھیں کیسی دلہن پسند ہے؟" بڑی آپا کا رخ اس کی طرف ہوجاتا۔

تائی اماں بول اٹھتیں "اجی تمھیں نہ بتادے گا وہ مجھے بتادے گا۔ بیٹا میرے کان میں بتادے، جیسی دلہن کہوے گا ویسی ہی ڈھونڈ کے لادوں گی۔"

"ہاں آں دلہنیں تو کھیرا ککڑی ہیں نا کہ پینٹھ میں گئے اور خرید لائے۔" بڑی آپا کی آواز میں گرمی پیدا ہوجاتی "تائی اماں، اچھی دلہن گری پڑی نہیں ملتی ہے۔"

موضوع اس آہستگی سے بدلتا کہ اسے احساس تک نہ ہوتا اس کی شادی سے ہٹ کر لڑکوں لڑکیوں کی عمومی حالت پر باتیں ہونے لگتیں اور بات کہیں سے کہیں پہنچتی۔ وہ پھر الف لیلہ پڑھنے میں لگ جاتا۔ اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں سب سے دیر میں دھوپ پہنچتی تھی۔ کیاری سے ہٹ کر جہاں پودینے کے علاوہ بیلے کے بھی کئی پودے کھڑے تھے، نیم کا گھنا پیڑ تھا، جس کے نیچے دیوار کے سہارے لمبی گھڑونچی بنی تھی کہ خود ہری بھری ایک کیاری تھی، کورے کورے گھڑے کچی ٹھلیاں، کالی اک صراحی جس کی پتلی لمبوتری گردن میں اکثر بیلے کے پھولوں کا گجرا پڑا ہوتا، چمکتا دمکتا مراد آبادی گلاس اور نیم کے زردی مائل سفید پھول کہ گھڑوں کی بھیگی طشتریوں پہ، گلاس میں، گھڑونچی پہ ایک طرف رکھی ہوئی پانوں کی تر بتر تھالی میں اور گھڑونچی کی کچی زمین پہ بکھرے ہوتے۔ سرکنڈوں کی تیلیوں والا مونڈھا اس نے کیاری اور گھڑونچی کے بیچ میں دیوار کے سہارے ڈالا تھا اور اسے اپنی مستقل بیٹھک قرار دیا تھا۔ پاس ہی چھپر کھٹ پہ بڑی آپا، امی اور تائی اماں بیٹھی رہتیں، باتیں ہوتی رہتیں، پاندان کھنکتا رہتا اور سروطہ چلتا رہتا۔ کبھی کبھی باوا کا بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دم

گھٹنے لگتا اور ایک چارپائی نیم کے نیچے پڑ جاتی۔ چاروں طرف پیلے پیلے اور زردی مائل سفید بوسیدہ کاغذ پھیلے بیچ میں باوا جو عینک لگائے ہر کاغذ کے ایک ایک لفظ کو احتیاط سے پڑھتے اور پرانے دھرانے ایک بستے میں تہہ کر کے رکھتے جاتے۔ اس عرق ریزی کے باوصف ایسا رقعہ کوئی اب ہاتھ نہیں آیا تھا کہ گروی پڑی حویلی کا مقدمہ جیتنے کی صورت پیدا ہوتی۔ لمبا چھڑی سا قد، رنگ گندمی، بال کھچڑی خاندان میں پہلے شخص تھے کہ پتلون پہنا اور سرکاری نوکری کی۔ تائی اماں کو ان کی روش پر ہمیشہ اعتراض رہا، کہا کرتی تھیں "اجی تحصیل داری سے پہلے طور یہی تھا، برجس ڈاٹے فل بوٹ چڑھائے کھٹ کھٹ کرتا شکار سے واپس آیا۔ بندوق کونے میں رکھا، تھیلہ گلے سے اتار، فل بوٹ ایک طرف پھینک، چوکی پہ کھڑا ہو نماز پڑھنے لگا۔ میں ہاہا کرتی کی شبو میاں برجس اتار دو، وضو کرلو، شبو میاں کہاں سنے ہیں۔" تائی اماں ولایت میں بھی لوگ نماز پڑھیں ہیں۔ وہاں پاجامہ کوئی نہیں پہنتا۔" خاک بھوبھل پڑے ولایت والوں پہ برجسوں اور پتلونوں میں لوگ نماز پڑھنے لگیں تو قیامت نہ آجاوے اور بی تحصیل داری کے بعد تو جنٹلمینی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ ابا میاں مجھ ڈوبی کو طعنے دیوے تھے" تائی اماں تمہارے شبیر حسین تو بالکل انگریز ہو گئے ہیں۔ تم نے پالا تھا تم ہی جانو۔" اے میاں میں کیا جانوں، میں نے پالا تھا یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ بیٹا انگریز بن جا۔" مگر عمر کے ساتھ ساتھ اب انگریزیت بھی بہت کم ہوگئی تھی۔ رہی تحصیلداری سے آئے تو تھے چھٹی لے کر لیکن ابا میاں کے گزرنے کے بعد اتنی ذمہ داریاں آپڑی تھیں کہ یہی سوچا کہ پنشن میں اب کون سی مدت باقی ہے، یہ مدت رخصت پہ کاٹو، آخر رخصت بھی تو برسوں سے نہیں لی تھی اور نوکری چاکری سے فارغ ہو کر گھر پہ بیٹھو۔ حویلی کا مقدمہ ایک طرف، پھر زمینوں کی دیکھ بھال کھیتی باڑی کا انتظام، پھر اس کوٹھی کی منصوبہ بندی جس کی تعمیر کا خیال پنشن لے کر گھر بیٹھنے کے خیال کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ روز منہ

اندھیرے اٹھنا، بھونڑ پہ جا کر کھیتوں کو دیکھنا، کوٹھی کی جگہ کا جائزہ لینا، واپسی پر انھیں پہلے بوسیدہ کاغذوں پہ جھک جانا۔ کاغذ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے اور دم لینے کو عینک اتار کے کاغذوں پہ رکھتے، کم گوئی کے باوجود کبھی کبھی کوئی فقرہ منھ سے نکل ہی جاتا۔ بڑی آپا کی توجہ فوراً باتوں سے ہٹتی، بھائی کے فکر مند چہرے کو تکنے لگتیں" یہ تو بڑا غضب ہوگا۔"

باوا ناخوش سے لہجے میں کہتے" ابا میاں بھی تو غضب کر گئے ہیں۔ اتنا سود نبٹانے کے لیے رقم کہاں سے آئے۔"

بڑی آپا کی آنکھیں بھیگنے لگتیں، آواز میں رقت پیدا ہو جاتی " باغ تو پہلے ہی نیگ چڑھ گیا تھا، بزرگوں کی یہ بچی کچھی یادگار بھی۔۔۔" بڑی آپا چپ ہو جاتیں، پھر کہنے لگتیں " اماں جی یہیں سے سدھاریں، ابا میاں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی اسی گھر میں آنکھ بند کی۔ بڑے ابا نے بھی آخری سانس یہیں لیا۔" بڑی آپا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور باوا پھر کاغذوں کو پہلے بے دلی سے اور پھر انہماک سے الٹنے پلٹنے لگتے۔

اس کی آنکھوں میں پوری حویلی کہ مانند ایک برِ اعظم کے تھی گھومنے لگتی، ڈاٹ کی چھتوں والے اونچے کشادہ کمرے، اونچے دروں والے لمبے لمبے دالان، مٹی میں اَٹی اندھیری بخاری جس کے اندر جھانکتے ہوئے اسے ہمیشہ ڈر لگا کہ کہیں بخاری کی باسی بیچا اندر نہ کھینچ لے، تہہ خانہ جس کے اور چھور کا اسے کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کے تین جنگلے دالان کے نیچے آنگن میں نکلے ہوئے تھے مگر ایک جنگلا دالان کے اندر کے بغلی کمرے میں بھی نکلتا تھا اور بڑا جنگلا کمرے کے اندر والے چھوٹے اندھیرے کمرے میں کھلتا تھا اور لمبی چوڑی ران جہاں چھتیں کہ زینے میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا کہ کسی اجنبی ملک میں داخل ہو رہے ہیں اور کسی کسی کچی چھت پہ اُگی ہوئی گھاس کہ برسات نکل جانے پر سوکھی مرنڈ ہو جاتی اور کسی قدیم زمانے کی یادگار نظر آتی، پپڑی جمے سوکھے پت نالے کہ سوکھ جانے والے دریا سے لگتے اور پھر وہ پُراسرار سرحد، سفید بیٹوں

سے لسی ہوئی سیاہی مائل منڈیر، جس کے پرے اونچی نیچی کچی پکی ان گنت چھتیں پھیلی نظر آتیں اور آگے ان سے وہ سرخ پتھروں والا اونچا مندر، جو یوں نظر آتا جیسے ہمالیہ پہاڑ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ حویلی کی چھت بستی میں سب سے اونچی تھی۔ حویلی کی وسعت اور قدامت اور بلندی کا پورا احساس اس وقت ہوتا تھا جب تائی اماں غدر کے دنوں کا ذکر سناتی تھیں۔ "بی بی میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی اماں سنایا کریں تھیں۔ ایسی لٹس پڑی اور آپا دھاپی مچی کہ ایک کو ایک کی خبر نئیں۔ بھر بستیں ایسی اجڑیں کہ نہ کوئی نام لینے والا رہیا نہ پانی دینے والا۔ کوسوں چراغ جلے تھا نہ دھواں اٹھے تھا۔ جاٹ، گوجر، رانگوھڑ، پوربیے، دھولیے بھالے بلم نچاتے دندناتے پھرتے۔ آج یہ گاؤں لوٹا، کل اس بستی پہ ہلا بولا پرسوں فلاں شہر پہ جا پڑے۔ کوئی شہر کوئی گاؤں نہ بچا کہ جہاں غدر نہ مچا ہو۔ بس ہماری بستی بچی تھی۔ سب نے مل کے کیا کیا کہ اپنی اپنی عورتوں کو حویلی میں بھیج دیا اور خود لٹھ تان تان کے بستی کے گرد پہرہ دینے لگے۔ حویلی کی چھت یہ سمجھ لو کہ سب سے اونچی تھی دور تک کا آدمی واں سے نظر آوے تھا۔ تین آدمی نقارے لے کے چھت پہ بیٹھ گئے۔ دن رات جاگیں تھے۔ مٹے گوجروں نے تین دفعے ہلہ بولنے کی ٹھانی، تینوں مرتبہ نقارہ بج بج گیا اور وہ تینوں دفعے باہر سے ہی لوٹ لوٹ گئے۔"

حویلی کی بلندی بھی قائم تھی اور وسعت بھی مگر وہ پرانی کتنی ہوگئی تھی۔ ممٹیاں اور برجیاں کچھ تو ایسی ٹوٹی تھیں کہ بس آثار باقی تھے۔ جو باقی تھیں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں۔ منڈیریں کالی پڑ چکی تھیں اور دیواروں سے بوسیدہ پلستر کے پرت گرتے تھے اور اتنے گر چکے تھے کہ لکڑیا اینٹوں سے بنی دیواریں ننگی ہوتی جا رہی تھیں اور لکڑیا اینٹوں کی درزوں سے پیلی پیلی مٹی، ہر وقت گرتی رہتی تھی۔ دالان میں کمروں میں فرش پہ دیواروں کے سہارے جا بجا پیلی پیلی مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریاں بن جاتیں اور پھر ان

میں سے کبھی اللہ میاں کی بھینس نمودار ہوتی کبھی تیلیا راجہ اسے خوب کریدتا اور اپنے لیے سوراخ پیدا کر لیتا۔ پرانی جو چیز نظر نہیں آتی تھی وہ آنگن تھا لمبا چوڑا کچا آنگن کہ تیسرے پہر کو سقہ جب پہلی مشک بہاتا تو بس تھوڑی دیر کے لیے زمین گیلی نظر آتی اور بھاپ اٹھتی دکھائی دیتی اور اس کے بعد پھر زمین پیاسی کی پیاسی، کئی مشکوں کا چھڑکاؤ ہونے کے بعد زمین تر ہوتی اور خوشبو دیتی اور پھر باوا کا تازہ حقہ مونڈھے کے آگے رکھا بہار دیتا اور وہ نیم جسے وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا اور جانے کب سے کھڑا تھا مگر اسی طرح ہرا بھرا اور گھنا تھا کہ اس کے تلے ہمیشہ چھاؤں رہتی پھر وہ گھڑونچی جو مانند ہری بھری کیاری کے تھی اور وہ کیاری کہ مثل گھڑونچی کے پانی میں تر بتر رہتی اور خوشبو سے مہکتی رہتی۔ گوری لمبی انگلیوں میں جھمکتے مرادآبادی گلاس اور اس میں کچی ٹھلیا سے، کبھی کوری صراحی سے گرتے ہوئے مہکتے میٹھے پانی کا رسیلا شور، تحسینہ اس کی طرف توجہ کیے بغیر پانی پی گلاس گھڑے کے پیچھے رکھ پھر باورچی خانے کی طرف چلی جاتی اور وہ پھر الف لیلہ پہ جو اس نے ابا میاں کی کتابوں سے نکال کر وقت گزاری کی نیت سے پڑھنی شروع کر رکھی تھی، جھک پڑتا، الف لیلہ پڑھتے پڑھتے کھو جاتا اور بھٹکتے ہوئے شہزادوں کے ساتھ خوبصورت سنگ دل ساحراؤں کی محل سراؤں مین داخل ہو جاتا۔۔۔"ہوا بند ہوگئی۔" بڑی آپا کی آواز کے ساتھ وہ ایک ساتھ الف لیلہ کی محل سرا سے باہر آ جاتا اور اس وقت اسے پتہ چلتا کہ بدن اس کا پسینے میں بھیگتا جا رہا ہے۔ سبز و سرخ لہریوں والا پنکھا بڑی آپا کے ہاتھ میں گردش کرنے لگتا "کمبخت ابھی سے اتنی مکھی ہے، برسات میں تو جانیں کیا حال ہوگا۔"

تائی اماں ٹوکتیں "بی بی برسات کہیں ہو تو سہی، اساڑ گزر چلا اور پانی کی بوندنئیں پڑی۔ تو بہ اب کے تو بہت گرمی ہے۔ میرا تو مروڑیوں سے پنڈا الس گیا۔"

پھر نیم کی ٹہنیوں میں ایک ہلکی سی لرزش تیرتی چلی جاتی اور امی کہتیں "اللہ تیرا شکر۔"

نیم کی گھنی ٹہنیوں کے کسی گوشے سے اچانک فاختہ بولنا شروع کر دیتی اور ساتھ اس کے بنی آواز میں آواز ملانے لگتی "کوٹوں گی۔۔۔پیسوں گی۔۔۔آیا تھا۔۔۔گیا تھا۔۔۔کوٹوں گی، پیسوں گی، آیا تھا، گیا تھا۔۔" فاختہ بولتے بولتے چپ ہو جاتی اور پروں کی سرمئی پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ ٹہنی سے بلند ہوتی، ایک چرخ کھاتی اور پھر حویلی کی بلندی سے پرے نکل جاتی۔ تحسینہ باورچی خانے سے نکل کیاری پہ آ بیٹھتی اور پودینے کی ننھی مہکتی پتیوں کو چنتے چنتے مونڈھے کے بالکل قریب آجاتی کہ وہ گوری گردن پہ پسینے کے شفاف قطرے دیکھ سکتا۔ چٹیا کے نیچے سے نکلے ہوئے مہین بال بھیگی گوری گردن پہ چپکنے لگتے اور سفید وائل کی باریک قمیص کہیں کہیں سے بھیگ کر سڈول بھری ہوئی پشت میں پیوست ہوتی نظر آتی۔ گردن اور پشت سے نظر ہٹا کر وہ پھر الف لیلہ پر نظریں گاڑ دیتا لیکن چند ہی لمحوں میں عزم اس کا ٹوٹنے لگتا اور نظریں اس کی پھر چوری چھپے چمکتی اور بندھی چٹیا پہ گوری گردن پہ بھری بھری پشت پہ، پودینے کی مہکتی ہری گیلی پتیوں میں رینگتی ہوئی اور بھیگتی ہوئی گوری پتلی انگلیوں پہ بھٹکنے لگتیں۔

امی کی ہمدردی کی رگ اک روز پھڑکی تو بول پڑیں "بڑی آپا تحسینہ غریب تو کام کرتے کرتے بڑی ہوئی جاوے ہے۔ اتنے بڑے ٹبر کا سارا کام ایک جان پہ پڑ گیا ہے یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

بڑی آپا بولیں "ہلکان ہونے کی کیا بات ہے اس میں۔ گھر کا کام ہے باہر والے تھوڑا ہی آکے کریں گے۔"

"بڑی آپا" امی بولیں "تم نے تو یہ ستم کیا ہے کہ سارا کام اسی پہ ڈال دیا ہے۔"

"اجی کنواری لونڈیوں کو کام کی عادت ہونی چاہیے۔ آخر پرائے گھر جانا ہے۔ واں انھیں چھپر کھٹ پہ بٹھا کے کون کھلاوے گا۔"

"اے لو بری آپا تم الٹی بات کہو ہو۔ کنوارپتے کے دن ہی تو ہووے ہیں کہ ہنس بول

لو، اس کے بعد کہاں یہ مہلت، نابی بی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں بیٹھی بیٹھی کب تک بان توڑوں۔۔۔"

"نا بہو میں تمھیں چولہے پہ نہ بیٹھنے دوں گی۔" بڑی آپا نے فوراً احتجاج کیا۔

امی نے عزم باندھا اور توڑ دیا، کام پھر تحسینہ ہی کو کرنا پڑتا۔ گھر کا نظام اسی پرانے ڈھرے پہ جاری رہا۔ تحسینہ کی کفایت شعاری کے احساس نے یہ فرق ڈالا کہ امی کا پیسہ کوڑی بھی اس کے پاس جمع رہنے لگا۔ اسے روز اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا "کتنے؟" وہ سوال کرتی۔ جتنے مانگتا اتنے دے دیتی، مگر اس تکلف کے ساتھ گویا پیسے ضائع کرنے کے لیے دیے جارہے ہیں۔ اچھے اور بنی آن نازل ہوتے اور اس سے ایک ایک آنہ وصول کر لیتے اور پھر گھر بھر مین اس کا اعلان کرتے۔ بنی کو بڑی آپا جھڑکتیں، پھر اس پہ بگڑتیں "بیٹا اسے کیوں پیسے دیے جاتے ہو۔ چٹوری ابھی بازار جاوے گی اور پھینک آئے گی۔" اچھے کو پیسے ملنے پر تائی اماں اسے بھر بھر گود دعائیں دیتیں۔ "باپ کی طریوں افسر بنے، حکومت کرے، سہرا جلدی بندھے، چاند سی دلہن گھر میں آوے، ماں باپ بہاریں دیکھیں۔" تائی اماں کے بال سفید ہو گئے تھے، لیکن کاٹھی ابھی تک بنی ہوئی تھی کہ پاجامہ پھنس کے ٹانگوں میں آتا تھا اور چہرے کی جھریوں کے باوجود پتہ چلتا تھا کہ کسی زمانے میں حسین ہوں گی۔ ایک بڑی آپا تھیں کہ جسم کی عمارت ہل گئی تھی اور دوہرا بدن دوہرا ہوتے ہوتے بھی اکہرا ہو گیا تھا کہ جو کپڑا پہنتیں خلتے سے لٹکتے۔ تائی اماں کس رشتے سے تائی اماں تھیں اسے اب تک پتہ نہیں تھا۔ ایک دو کی نہیں گھر بھر میں سب ہی کی تائی اماں تھیں۔ یہاں تک کہ ابا میاں بھی انھیں تائی اماں ہی کہا کرتے تھے۔ ان کی بیٹی کے متعلق اسے بس دھندلا دھندلا خیال تھا کہ ایک گوری چٹی بڑی بڑی آنکھوں والی لمبے قد کی عورت تھی۔ اس کی رخصت کے بعد بڑی آپا نے کہا تھا "تائی اماں کی لونڈیا تو ڈوب گئی۔ یہ تو بالکل گنوار

لوگ ہیں۔" اور امی نے جواب دیا تھا" اجی اب عرش کا تارا تھوڑا ہی اترتا۔ اچھا ہے غریب لوگ ہیں لونڈیا کو اچھی طرح رکھیں گے۔" پھر کب اور کیسے، یہ اسے یاد نہیں تھا۔ بس اتنا یاد تھا کہ مرنے کی اس کی خبر آئی تھی جب تائی اماں اس کے چالیسویں کے بعد واپس آئیں تو ایک گورا چٹا بچہ ہر وقت ان کی گود میں ہوتا اور اچھے کے نام سے اسے کھلاتیں اور پلاتیں۔

اچھے اور بنی پیسے ملتے ہی تیر کی صورت باہر جاتے اور تھوڑی دیر میں وہ دیکھتا کہ سینکوں میں لگے ہوئے برف کے گولے، جن میں زرد، سرخ، سبز رنگ تیرتے ہوتے، لیے چلے آرہے ہیں اور زبان لگا لگا کے انہیں چاٹتے ہیں۔

مونڈھے پہ بیٹھے بیٹھے وہ تھک جاتا، الف لیلہ بند کر جمائیاں لیتا، پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں، اتنے میں بڑے کمرے سے بڑی آپا کی آواز آتی "ارے بھئی ضمیر کہاں ہیں۔ ابھی تک باہر بیٹھے ہیں۔ تحسینہ بھیے کو بلا کر کھانا کھالو" تحسینہ باہر آتی، روکھے پھیکے انداز میں کہتی" کھانا کھالو چل کے۔" اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی وہ اتنا بیزار ہو جاتا کہ کھانے کو اس کا مطلق جی نہ چاہتا۔ اسے اپنے آپ پہ غصہ آتا، تحسینہ پہ غصہ آتا، بند ہو جانے والی ہوا پہ، بھنبھناتی ہوئی مکھیوں پہ، چھٹیوں کے طویل ہوتے دنوں پہ۔ تحسینہ پھر آ کر اسی روکھے پھیکے انداز میں کہتی" کھانا کھالو چل کے۔" اور وہ الف لیلہ بند کر پھر چپکے سے اس کے پیچھے ہو لیتا۔

(۳)

''بجلی بجلی میرا بیاہ کدھر؟'' امیا کی گھٹلی کی گرمی منی کی نرم انگلیوں سے پھسل کر چار پائی سے نیچے جا پڑی۔

چار پائی پہ ایک طرف ہرے چھلکوں اور کٹی ہوئی سفید بجلیوں کی ایک ڈھیری لگی تھی۔ اور پاس ہی سفید تسلے میں سفید چھلی ہوئی امیاں بھری رکھی تھیں۔ تحسینہ سفید چھلی ہوئی ثابت امیا اٹھاتی۔ چاقو سے دو کرتی اور پھر چاقو کی نوک سے بجلی کے ٹکڑوں کو نکال امیا کی قاشوں کو تسلے میں ڈال دیتی۔

بنی نے اپنی چمکتی ہوئی ثابت بجلی اٹھائی اور ضمیر کے مونڈھے کے پاس آ کھڑی ہوئی ''ضمیر بھائی بتاؤ میرا بیاہ کدھر ہوگا؟''

''خود بوجھ لو۔'' وہ اس وقت الف لیلہ پڑھنے میں اتنا مصروف تھا کہ نظریں اٹھانا بھی ناگوار ہو رہا تھا۔

بنی نے بجلی سے اپنا بیاہ پوچھا۔ پھر اچھے کا بیاہ پوچھا۔ پھر ضمیر بھائی کا۔ ضمیر بھائی تمہارا بیاہ پچھم میں ہوگا۔''

''اچھا۔'' اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا اور پھر کتاب پڑھنے لگا۔

"بجلی بجلی باجی کا بیاہ کدھر؟"

بجلی ٹپ سے اس کی کھلی کتاب میں آ کے گری۔

بنی نے تالی بجا کے شور مچایا "آہاہا باجی کا بیاہ ضمیر بھائی سے ہوگا۔"

دل اس کا دھک سے رہ گیا۔ خون خشک اور ہاتھ پیر جانو جمے کے جمے رہ گئے۔ بس یہ خواہش کہ کسی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ باہر چلا جائے پر جسم ساکت تھا اور نظریں کتاب پہ اسی طرح جمی ہوئیں اور دل دھڑ دھڑ کرتا تھا۔ ہوا پھر بند ہو گئی تھی اور ٹہنیاں نیم کی پھر سر نیوڑہائے خاموش تھیں۔ پسینے کے قطرے اس کی گردن پہ اور اس کے ماتھے پہ ابھر آئے تھے۔ گردن پہ سرسراتے قطرے کالر کے اندر رسنے لگے۔ پھر ایک پتلی گیلی لکیر قمیص کے اندر پیٹھ پہ سرکتی ہوئی رینگنے لگی۔ دل میں آئی کہ کتاب بند کرو اور آنکھ بچا کر آہستہ سے باہر نکل جاؤ مگر جسم تھا کہ اسی طرح اپنی جگہ پہ جما تھا۔ تحسینہ کی طرف دیکھنے کی تو اسے ہمت نہیں ہوئی تھی لیکن چاقو کے امیوں میں دردرانے اور بجلیوں کے سینے میں اترنے کی مدہم آواز اسی رفتار سے بغیر کسی فرق کے آئے جا رہی تھی۔ ہوا بند تھی اور ٹہنیاں نیم کی سر نیوڑہائے خاموش تھیں۔ پھر فاختہ نے نیم کی کسی خاموش ٹہنی پہ بیٹھے بیٹھے بولنا شروع کر دیا۔ بجلی سے۔ بنی کی توجہ بھٹکی (اور وہ آواز میں آواز ملانے لگی "کوٹوں گی۔۔۔ پیسوں گی۔۔۔ آیا تھا۔۔۔ گیا تھا۔۔۔ کوٹوں گی۔۔۔"

"صبح کا سبق یاد کر لیا؟" تحسینہ بولی اور بنی کو جانو بریک لگ گیا۔

"س۔۔۔ ب۔۔۔ ق۔"

"ہاں سبق۔" تحسین نے اسی اطمینان سے درشت لہجے میں کہا اور چاقو الگ رکھ تسلا سنبھال چارپائی سے اٹھنے لگی۔

بنی خاموش۔

"نکالو سیپارہ اور پڑھنے بیٹھو۔" اس نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

بنی کا دم خش، تیزی طراری ساری ختم ۔جیسے کوئی قیدی ہو۔اس نے بڑی بے چارگی سے آہستہ آہستہ جزدان کھولا۔وہ انگلیاں،وہ ہاتھ جن میں ابھی بجلی سے بیاہ پوچھتے ہوئے بجلی دوڑ رہی تھی،اب مجبور تھے اور حکم کے پابند۔اس نے مرے ہوئے دل سے سیپارہ نکالا اور ورق الٹ پلٹ کر کے سبق ڈھونڈ نے لگی۔

تحسینہ نے امیوں کا تشلا اٹھایا، نیم کے نیچے سے اٹھ کر دھوپ میں پڑی ہوئی چارپائی کے پاس گئی تشلا الٹا اور امیوں کی قاشوں کو کھری چرپائی پہ پھیلا نے لگی۔

ضمیر کتاب آہستہ سے بند کر،مونڈھے پہ رکھ،دبے پاؤں باہر ہولیا۔

گلی خاموش تھی۔خاموشی میں گھلی ملی ایک بھنبھناہٹ۔ایک گونج جیسے کہیں دور شہد کا چھتا ٹوٹنے پر بہت سی مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔گلی میں چھاؤں پھیلی تھی،سوائے ان دیواروں اور نالیوں کے جن کے مقابل کے مکان اونچے نہیں تھے۔ایک کتا کہ جانے کب سے نالی کے گندے میلے پانی میں بیٹھا زبان نکالے ہانپ رہا تھا،قدموں کی آہٹ سن کر باہر نکلا۔ پورے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور گیلے جسم سے بوندیں برساتا ایک طرف کو ہولیا۔اپنی گلی سے مڑتے ہوئے کوڑے کے ایک ڈھیر پر اونگھتی ہوئی مرغیوں نے چونک کر چونچیں اٹھائیں اور" کڑ" کی ایک دھیمی سی بے ساختہ آواز ہوئی۔ دم بھر کے لیے اسے گمان گزرا کہ بھول کر کسی اجنبی گھر میں کسی زنان خانے میں داخل ہو گیا ہے اور ایک دم سے بہت سی نظریں اس پہ اٹھ گئی ہیں۔وہ آہستہ سے آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چلا تھا کہ پیچھے کسی مرغے نے زور سے بازو پھٹ پھٹائے اور کڑوں کی آواز بلند کی۔سامنے دیوار کی سایہ دار منڈیر پہ ایک اونگھتا ہوا سفید براق مرغا چونکا،پھریری لی، زور سے بازو پھٹ پھٹائے اور جوابی ککڑوں کوں کی بانگ بلند کی۔

گلی سے نکل کر وہ لال مندر کے چوک میں آ گیا۔لال پتھر جل رہے تھے،پگھل رہے تھے۔کنوئیں کی سرخ سنگین من تپ رہی تھی۔لوہے کی چھوٹی بڑی چرخیاں کہ کنوئیں

کے دہانے کے گرد نصب تھیں، خشک تھیں، خاموش تھیں۔

پیاؤ کی گلی سے نکلتے ہوئے اسے ٹھنڈک لگی، پر گھڑی بھر میں ٹھٹھیروں والی گلی آ گئی جہاں دھوپ اور دھواں تھا اور بے شکل دھاتوں اور پیتل اور تانبے کی بڑی بڑی تھالوں اور دیگچوں اور پتیلوں پہ پڑتی ہوئی چوٹوں سے اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جیسے جیسے آگے بڑھا شور کم ہوتا گیا، پیچھے گم ہوتے ہوئے رستے میں لپٹتا گیا۔ کنجڑوں والی گلی میں کالا بجار بیچ میں اڑا کھڑا تھا۔ کوشش پر بھی جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو وہ دیوار سے لگ کر آہستہ آہستہ چلتا، لاتوں اور سینگوں کی مار سے بچتا، گلی سے باہر نکل گیا، گلی سے قصائیوں کے محلے میں، قصائیوں کے محلے سے پکی سڑک کو پھلانگتا ہوا دگڑے میں، دگڑے سے بھونڑ والے رستے پہ۔

اسے دیکھ کے گندل کھڑا ہو گیا" بے ہیرا۔" اس نے ہیرا کو پکار کے بلایا" چھوٹے میاں جی آیو ہیں، کھاٹ ڈال دے۔"

ہیرا چارپائی لیے دوڑا دوڑا آیا، چارپائی بچھاتے ہوئے بولا" میاں جی جل پانی لاؤں۔"

"نہیں بھئی۔"

گندل چلم لے کے چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کنواں اس وقت نہیں چل رہا تھا اور گندل اور ہیرا فارغ نظر آ رہے تھے۔ گندل نے چلم منہ سے لگائی اور آنکھیں اس کی مندنے لگیں۔ ہیرا اس کے آنے پہ کچھ زیادہ پرجوش نظر آتا تھا۔ آنکھوں میں اس کی چمک پیدا ہو گئی تھی اور ایک بے تابی کہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ سکے۔

"چھوٹے میاں!" آخر اس کی زبان کھل ہی گئی۔" چھوٹے میاں!" یو کیوے ہیں کہ یاں پہ کوٹھی بنوگی۔ وا کے بعد تو سگرا ٹبر حویلی سے یہیں پہ آجاوے گا۔ جدوں ابا میاں تھے تو یاں پہ گھنی رونک رہوے تھی۔ کٹائی کے دنوں میں تو سگرے یہیں پہ رہوے

تھے۔ پروا کے بعد تو۔۔۔'' ہیرا کی آواز دھیمی پڑ گئی'' نام رام کا۔''

چپ بیٹھا رہا۔ گندل بھی چپ تھا، آنکھیں بند تھیں اور چلم کے کش جاری تھے۔

ہیرا پھر بولا ''تو چھوٹے میاں، تحصیل دار صاحب اب تو ٹکیں گے؟''

''ہمبے'' اس کی طرف سے گندل نے جواب دیا'' پنشن لے ریو ہیں۔ وا کے بعد یئیں ٹکیں گے۔''

''تو چھوٹے میاں، تم بھی پلٹ کے نئیں جایو؟''

''چھوٹے میاں کی تو پڑھائی پوری نئیں بھئی ابھی۔'' گندل نے پھر اس کی طرف سے جواب دے دیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں، کھانسا اور چلم کو ہیرا کے ہاتھ پکڑاتا ہوا بولا ''چھوٹے میاں اب تو گھنے برس بیت گیو، یو تمری پڑھائی کا کب انت بھئے گا۔''

''بس تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

مگر گندل اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آس پاس کی چیزوں سے ہٹ کر سامنے کے کھیتوں میں پہنچ گئی تھیں جہاں ہریالی پہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہوتا تھا۔ جلدی جلدی چلتی ہوئی دھوپ اس کے پیچھے دوڑتا ہوا سایہ ابر کی ہلکی چادر کھیتوں سے پھیلتی چلی گئی اور دھوپ کھیتوں سے پرے پیڑوں کی قطار کو چھوتی ہوئی آگے پھلانگ گئی۔ گندل اور ہیرا دونوں کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں اور خود اس کی بھی۔ اکا دکا تیرتے ہوئے سفید بادل آپس میں گھل مل کر سورج پہ چھا گئے تھے۔

''گندل'' ہیرا آہستہ سے بولا ''یو ورشا کیا کہوے ہے۔ میری تو، گندل، کنواں چلاتے چلاتے کانچ نکل گئی اور بوند نہ پڑی تو بیلوں کی بدھیا بیٹھ جاوے گی۔'' اس نے چلم کو آہستہ سے گندل کی طرف بڑھا دیا۔

گندل نے خاموشی سے چلم کا گھونٹ بھرا، پھر سوچ بھرے لہجے میں بولا ''ورشا اب کے دیر سے ہوگی۔ جوتشی جی کہیو تھے کہ یو سال سخت ہے۔'' اس نے پھر چلم کا گھونٹ

لیااور ہیرا کی طرف چلم بڑھادی"لالہ یو میں آنچ مندی ہوگئی،اپلا رکھ دے۔"
ہیرا چلم لے کر بھوبھل میں دبے اپلے کے پاس جا بیٹھا۔گندل کی آنکھیں پھر مندنے لگیں۔آنکھیں مندنے لگیں اور ہونٹ ہولے ہولے ہلنے لگے۔

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایو کھائے
ہیرا جنم امول تھئو کوڑی بدلو جائے

گندل کی آنکھیں بند تھیں،جسم ساکت،سارے بدن کا جی آواز میں کھینچ آیا تھا جو دھیرے دھیرے ابھر رہی تھی،پھیل رہی تھی۔
چارپائی سے اٹھ وہ آہستہ سے واپس گھر کی طرف ہولیا۔کھیتوں سے پرے کے درختوں پہ دھوپ پھر اتر آئی تھی۔دھوپ پلٹ رہی تھی،درختوں سے کھیتوں میں اتر رہی تھی اور چھاؤں کی چھاؤنی اٹھ رہی تھی۔
گھر میں اس نے قدم رکھا تو دن ڈھلنے لگا تھا اور دالان کے سامنے صحن میں دور تک چھاؤں کی چوڑی پٹی پھیل گئی تھی،لیکن بڑے کمرے کے دروازے ابھی نہیں کھلے تھے اور خس کی ٹٹی پانی سے اسی طرح شرابور تھی۔صحن سے وہ دالان میں آیا اور بڑے کمرے کی طرف بڑھنے لگا کہ جاتے جاتے وہ جھجکا اور اس کا رخ بڑے کمرے سے ہٹ کر بغلی کمرے کی طرف ہوگیا۔اندر قدم رکھا تھا کہ امی اور تائی اماں باتیں کرتے کرتے چونکیں۔
"اے بیٹے اس دوپہری میں تو کہاں تھا؟" امی نے فوراً سوال کیا۔
"بھونڑ پہ چلا گیا تھا ذرا۔"
"بھونڑ پہ؟ لونڈے ہوش کی دوا لے۔قیامت کی لو چل رہی ہے اور شہزادے جنگلوں میں پھر رئے ہیں۔"
"اے ذرا ڈوبا منھ تو دیکھو لال ہو رہا ہے۔" تائی اماں نے ٹکڑا لگایا "آبیٹا لیٹ

جا، میں پنکھا کروں۔"

اس نے اس پیشکش کو غنیمت جانا اور جوتے اور قمیض اتار آہستہ سے لیٹ گیا۔ تائی اماں نے زور زور سے اسے پنکھا کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

دوپہر کو سب بڑے کمرے ہی میں آرام کرتے تھے کہ وہاں بڑا جھالر والا پنکھا لگا ہوا تھا۔ جسے نوری دوپہر بھر کھینچتی تھی اور خس کی ٹٹیاں دروازوں پر کھڑی تھیں، جن پہ تیسرے پہر تک برابر پانی چھڑکا جاتا تھا۔ لیکن امی اب اکثر بچوں کے شور کے بہانے بڑے کمرے سے نکل کر بغلی کمرے میں آجاتیں اور کبھی کبھی تائی اماں بھی وہیں آ بیٹھتیں اور سونے کی بجائے دوپہری بھر باتیں ہوتیں، کبھی سرگوشیوں میں، کبھی بلند آواز سے۔

"اجی ایک بات ہے" تائی اماں کہہ رہی تھیں۔ "لونڈیا ڈوبی اٹھی بھی بہت خراب ہے سارے دن ادائی توائی پھرے ہے۔ پڑھنا یوں ہووے ہے، پتا مار کے بیٹھے تو پڑھے آخر آدمی ہے غصہ آہی جاوے ہے ایسے بچے پہ۔"

"تائی اماں یہ تم نے کیا بات کہی۔" امی جواباً بولیں "شریر آخر کون سا بچہ نہیں ہوتا؟ تمہارا اچھے کم شریر ہے کیا؟"

"اے وہ سب سے زیادہ شریر ہے۔ اتنا چخوادے ہے مجھے کہ ڈوبا میرا تو سر ہل جاوے ہے۔"

"تو بس تائی اماں بچے تو شریر ہی ہوا کریں ہیں۔ پر انھیں جان سے نہیں مارا جاتا۔ اجی اس لڑکی نے تو بہن کو دھنک ڈالا۔ دے پنکھے پہ پنکھا، میرا تو کلیجہ ہل گیا۔"

"ہاں ڈوبا ایسا تیہا بھی کیا کہ جان کو جان نہ سمجھے۔" تائی اماں چپ ہو گئیں۔

امی کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ ہولے سے بولیں "تائی اماں اس لونڈیا میں کچھ سنک ہے۔ کام کرے گی تو کام ہی کرے جائے گی۔ بہن کو پڑھانے بیٹھے گی تو پڑھائے ہی چلی جائے گی۔ جیسے ساتوں علم آج ہی پڑھا کے اٹھے گی۔"

''خیر یہ تو نسلی اثر ہے۔'' تائی اماں بولیں۔ ''ماں کچھ کم ہے بس جو سنک سوار ہو گئی سو سوار ہو گئی اور تیرا میاں؟۔۔۔ اب تو ماشاء اللہ بال بچے ہیں، ذمہ داریاں ہیں جب بچہ تھا تب دیکھتیں۔ ایسا ضدی تھا کہ ابا میاں غصہ کرتے مارتے پر کیا مجال کہ وہ اپنی ہٹ سے ٹل جاوے۔''

''ہاں خیر یہ نسلی اثر تو ہے مگر تائی اماں یہ بات تو اور ہے۔'' امی کی آواز اور دھیمی پڑی اور سرگوشی میں کہنے لگیں ''اجی یہ بڑی آپا اسے کب تک بٹھائے رکھیں گی۔ ماشاء اللہ پوری عمر ہے۔ بیاہ شادی کی فکر کرنی چاہیے اب تو اس کی۔''

''ہاں بی بی عمر تو پوری ہے۔ تمھارے ضمیر کی اور اس کی بس تھوڑی چھوٹائی بڑائی ہے۔''

''اجی تائی اماں ضمیر سے تو بہت بڑی ہے تحسینہ۔''

''نا بی بی!'' تائی اماں نے قطعی انداز میں تردید کر دی۔ ''جب وہ پیدا ہوئی ہے تو ضمیر پیٹ میں تھا۔ مجھے تو آج کی سی بات یاد ہے کہ جب چھموں چھلا نہائی تھی تو بیبیوں نے کہا تھا کہ لو بی بی نند تو بنٹ گئی، اب بھاوج کو ساتھ خیریت کے خدا فارغ کرے۔ اس وقت تجھے ساتواں مہینہ تھا۔''

''خیر لونڈیا کے ساتھ تو ڈھائی تین مہینے کی چھوٹائی بڑائی بھی بہت ہووے ہے۔ لونڈئیں جلد بڑھیں ہیں۔ اب دیکھتی نہیں ہو ضمیر سے دگنی عمر کی لگے ہے۔''

''ہاں ماشاء اللہ اٹھان اچھی ہے۔''

''آخر کیا سوچ رہی ہیں بڑی آپا؟''

''کیا خبر ہے کیا سوچ رئی ہے یہ بھی نئیں ہے کہ پیغام نہ ہوں۔ چچا کا لونڈا میجود ہے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد چچا تایا کہاں پوچھیں ہیں۔ مگر وہ ڈوبا تو بھتیجی کے لیے ترسے ہے۔''

''لونڈا کرے کیا ہے؟'' امی نے سوال کیا۔

''کیا پتہ ہے کیا کرے ہے۔ پڑھنا لکھنا جو گا تو وہ ہے نئیں۔ مدار کے مہینے میں بنیاد علی آئے تھے تو میں نے پوچھا کہ اجی بنیاد علی تمھارا امداد انٹرینس کب کرے گا؟ کہنے لگے کہ تائی اماں، انٹرینس تو کیا بی۔ اے بھی آج کل جوتیں چٹخاتے پھریں ہیں۔ ڈگری کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میں نے سوچا ہے کہ تمھارے امداد کو پولس میں بھرتی کرادوں۔ دو سال میں تھانیداری کا نمبر آجاوے گا۔۔۔ ہاں بی بی تھانے دار ہو جاوے تو پھر کیا چاہیے۔ حاکمی ہے وہ تو۔ مٹی کالی ڈگری کو لے کے کیا کوئی چاٹے؟''

''اجی تائی اماں کیا باتیں کرو ہو۔ تھانے داریئیں بٹتی تھوڑا ہی پھر رہی ہیں۔ ایف۔ اے۔ بی۔ اے کو تو تھانے داری ملتی نہیں ہے۔ اہڈ کو کون تھانے داری دے گا۔''

''بی بی مجھے کیا پتہ ہے تمھاری ڈوبی تھانے داریوں تحصیل داریوں کا۔ بنیاد علی یہی کہوے تھے۔''

''بنیاد علی چاچا کے کہنے کا کیا ہے وہ تو ایسے ہی شیخیاں بگھارا کرے ہیں۔ مگر خیر ہمیں کیا، امداد تھانے دار ہو جاوے تو ہمیں کیا برا لگے ہے۔ ہمارے تو گھر کی بیٹی جارئی ہے میں تو جانوں کہ بڑی آپا کو اب سوچنا نہیں چاہیے۔ لونڈا ایسا برا تو ہے نہیں۔ اب تحسینہ کے لیے عرش کا تارا تو اترے گا نہیں۔''

''کیا خبر ہے اس کے دل کی کیا سوچ رہی ہے۔'' تائی اماں بولیں اور اک ذرا معنی خیز انداز میں ''ابا میاں زندہ تھے تو ان کے سامنے بھی کئی دفعہ ذکر آیا تو وہ چپ ہو ہو گئے۔ وہ جانیں کیا سوچتے تھے۔''

کمرے کا دروازہ ہوا کے ایک تند جھونکے کے ساتھ دھاڑ سے کھلا اور پٹاخ سے بند ہو گیا۔

''آندھی آرئی ہے۔'' تائی اماں بے ساختہ بولیں۔

اس نے بھی چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ دالان میں اور آنگن میں زردی کھنڈی تھی۔

"کپڑے اٹھاؤ اپنے اپنے، زور کی اندھیاری ہے۔" بڑی آپا صحن سے چلا رہی تھیں۔

تائی اماں، امی سب کے سب باہر نکل گئے اور الگنی پہ لٹکے کپڑے اور چار پائیوں پہ بکھرے بستر لپک جھپک اٹھنے لگے۔

"اچھے، او اچھے اندر آجا۔" تائی اماں اچھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر دالان میں آ گئیں پھر پکارنے لگیں "بی بی اندر آجاؤ، کالی آندھی ہے یہ تو۔"

آندھیوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا۔ ہوا چلتے چلتے بند ہو جاتی، بڑی آپا کے ہاتھ میں سبز اور سرخ لہریوں والا پنکھا تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ فاختہ بولتے بولتے نیم کی پھننگ سے ، ازووں کی ایک میٹھی پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ اٹھتی چرخ کھاتی اور فضا میں تیرتی تیرتی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ کواو کواو کی نشیلی شیریں آواز کہ جانے کون سے آم کے پیڑ کی کون سی گھنی ٹہنی سے پُروا کا جھونکا بن کر اٹھتی اور گرم تپتی فضا میں ٹھنڈک کی اک لکیر کھنچتی چلی جاتی۔ گہری ہوتی چلی جاتی، پھر اک دم سے کوئل کی آواز بند، ٹھنڈک کی لکیر غائب۔ تائی اماں پنکھا بڑی آپا کے ہاتھ سے لے لیتیں "بی بی بڑی گرمی ہے۔ ہوا بند ہوگئی۔" اور بڑی آپا یکایک اس سے مخاطب ہوتیں "ضمیر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو" اندر پنکھے میں جا کے لیٹ جاؤ۔ ہر وقت پڑھنا ڈوبا پڑھنا نہی ہوا وبال جان ہو گیا۔" اور اتنے میں تائی اماں کا پنکھا جھلتا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا اور آنکھیں آسمان کو تکنے لگتیں۔ کھوئی کھوئی آواز میں، جس میں امید کے ساتھ ساتھ اندیشے کی بھی ایک خفیف سی کیفیت ہوتی کہتیں "آندھی آرئی ہے۔" ساری کی ساری نظریں ایک دم سے اوپر اٹھ جاتیں، جہاں آسمان پیلا پیلا نظر آتا اور اس کے سائے میں بہت سی چیلیں آہستہ آہستہ

دائرے بناتی ہوئیں، نشے میں نڈھال ناچتیں غش کھاتیں پھر اچانک سے نیم کی ٹہنیوں میں ایک ہیجانی لرزش ہوتی اور کسی گھنی ٹہنی میں کوئی چھپا کوا چونک کر کائیں کی آواز نکالتا اور پتوں کے ہرے پودوں سے نکل کر باہر آتا اور چیختا چنگھتا کووں کے شور مچاتے بھاگتے دوڑتے سراسیمہ غول میں جا شامل ہوتا۔ چڑیوں اور کوؤں کی سراسیمگی نیچے اترتی اور مرغیوں کو چونکاتی کہ ان کی گردنیں ایک دم سے ''قاں'' کی دھیمی سی آواز کے ساتھ کھڑی ہو جاتیں اور کان کچھ سننے کی کوشش کرتے۔ پھر یہ گھبراہٹ انسانوں پر اپنا اثر دکھاتی۔ دوسری تیسری منزل پر کسی کھلے دریچے کے کنواڑ ایک اچانک شور کے ساتھ بند ہو کر کھلتے اور پھر بند ہو جاتے ''میاں اندھی آرئی اے'' اور یہ آواز کوٹھوں کوٹھوں بلند ہوتی چلی جاتی۔ قریب و دور پھیلی ہوئی کچی پکی چھتوں سے چار پائیوں کے بستر اور تاروں پہ پڑی ہوئی سفید سفید چادریں اور نیلی پیلی ساڑیاں اور دھوپ میں سوکھتے ادھ گیلے گلابی فیروزی دوپٹے گرد میں اٹنے لگتے اڑنے لگتے۔ بڑی بوڑھیاں لڑکیاں بالیاں لپک جھپک دوپٹے اور ساڑیاں تاروں سے اتار بستر سروں پر رکھ منڈیریں پھلانگتیں سیڑھیاں اترتی نیچے آنے لگتیں اور کمروں کے دروازے اندر سے بند ہونے لگتے کہ اتنے میں دیکھتے دیکھتے ساری فضا میں زردی کھنڈ جاتی اور مٹیالے جھکڑ چلنے لگتے۔

آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ کبھی عین دوپہر میں آسمان پیلا پڑنے لگتا۔ کبھی سہ پہر کو تو کبھی شام کو۔ اور پھر سہ پہر کا وقت مقرر سا ہو جاتا کہ بندھے ہوئے وقت پہ آسمان میں زردی کا ایک ہالہ نمودار ہوتا اور اس کے سائے میں نشے سے نڈھال ناچتی اونگھتی چیلوں کے حلقے۔ مگر کسی دن باری ٹوٹتی اور رات کو سوتے سوتے فضا میں کہیں دور ایک اندھیری اٹھتی اور آنگنوں اور چھتوں اور کوٹھوں پہ نیند کا باندھا ہوا طلسم تیزی سے ٹوٹتا جاتا۔ آندھی کا کوئی رنگ مقرر نہیں تھا کہ عام طور پر تو پیلی ہوتی، لیکن کسی کسی دن ایکا ایکی پیلاہٹ میں کالونس پیدا ہوتی چلی جاتی، اور تیسرا پہر ہوتے ہوتے اتنا اندھیرا چھا جاتا کہ

دکانوں اور مکانوں میں لالٹینیں جل جاتیں۔

آندھی سہ پہر کو آتی، شاموں کو آتی، آدھی آدھی راتوں کو اٹھتی، مگر اس کا ثمر ہمیشہ صبح کو ظاہر ہوتا کہ گلیوں میں کنجڑے جھڑی ہوئی امیوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے لے کر آتے اور آنوں کا مال ٹکوں میں بیچ کر جاتے۔ کل کی کالی آندھی نے امیاں ہی نہیں امیوں کے لدے پھندے تناور درخت گرائے تھے۔ حویلی میں چارپائی پہ امیوں کا ڈھیر لگا تھا اور تائی اماں اور بڑی آپا کے ہاتھوں میں چاقو درد چل رہے تھے۔

''سنیں ہیں کہ ایک پتھر تین من کا شیخوں کی ٹال میں پڑا تھا وہ اڑ گیا، اور اڑ کے ایک دھینور کے چھپر پہ جا پڑا۔ ڈوبے کا چھپر گر پڑا۔''

بڑی آپا حیران ہونے لگیں ''تائی اماں مجھے تو یقین نہیں آتا۔'' پھر ضمیر سے مخاطب ہوئیں کہ اس کی سائنس دانی پر ان کو پورا اعتبار تھا اور جب کوئی بات انہیں خلاف عقل معلوم ہوتی تو اس سے رجوع کرتی تھیں۔ ''ضمیر میاں، تم نے تو سائنس پڑھی ہے تم بتاؤ تین من کا پتھر کہیں اڑ سکے ہے۔''

تائی اماں نے ضمیر کو بولنے کی مہلت نہیں دی ''ہم تمہاری ڈوبی سائنس وائنس کو تو جانتے نئیں ہیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ بڑھیا کنجڑی امیں لے لے کے کل تو آوے گی ہی، پوچھ لیجو۔ اے ہاں ڈوبی کی نند کا لونڈا آندھی میں اڑ گیا، اب تک تو ملا نئیں ہے۔''

بری آپا نے پھر تامل کیا ''عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ اتنا بڑا لونڈا اور آندھی میں اڑ جاوے۔''

''بی بی عقل میں کون سی بات آوے ہے۔'' تائی اماں کہنے لگیں ''یہ تو حیرت کا کارخانہ ہے میری تو کالی آندھی کو سوچ سوچ کے ہی عقل حیراں ہووے ہے۔ بس اس کے بھید وہی جانے۔''

''تائی اماں''، بنی بولی'' آپ کہہ رہی تھیں کہ کالی آندھی میں پریں ہووے ہیں۔''

''بیٹی میں تو یہ کہہ رہی تھی، ہم نے تو ایسا ہی سنا ہے، آگے جن پیچھے جن، تخت پہ راجہ اندر اور ارد گرد پریوں کا حلقہ۔''

''تائی اماں۔'' بنی سوچتے ہوئے بولی ''میں بتاؤں لونڈے کو کون لے گیا۔ اسے پرئییں اڑا کے لے گئیں۔''

بڑی آپا گرم ہو گئیں ''اسے دیکھو کیسی باتوں کے مٹکے ڈھالے ہے۔ سبق تو نے لیا آج؟ اری تحسینہ تو نے سبق دیا ہے اسے؟''

بنی کو جانے سانپ سونگھ گیا۔

''بنی ادھر آؤ، سناؤ سبق۔'' تحسینہ کی تحکمانہ آواز باورچی خانے سے آئی۔

تائی اماں کی باتوں کا تار ٹوٹ گیا تھا اور چاقو ہاتھ میں تیزی سے چلنے لگا تھا۔ ''اب تو امیا میں گٹھلی پڑ گئی ہے۔ آم اب آتا ہی ہوگا۔''

''آم تو آ گئے ہیں، چنپیلے ہیں۔'' بڑی آپا بولیں ''بوند پانی کی پڑے تو آم میں رس پڑے اور مٹھاس آوے۔''

کیریاں امیاں بنیں، امیوں میں بجلی پڑی، بجلی جالی بنی اور جالی نے گٹھلی کی وضع لی۔ آسمان بدستور تانبا بنا ہوا تھا، اور آم اسی طرح چنپیلے تھے۔ اوپر سے بوند نہیں پڑی اور اندر سے رس نہیں پھوٹا۔ روز اسی انداز سے سورج چڑھتا اور حویلی کے وسیع آنگن میں دھوپ اور چھاؤں کی آویزش شروع رہتی، چھاؤں پیچھے ہٹتے ہٹتے نیم کے نیچے سمٹ آتی اور سورج سر پر آجاتا۔ ڈیرا اٹھتا اور سب کے سب بڑے کمرے میں، نیم اندھیری فضا، لہراتا جھالر والا پنکھا، دروازوں پہ لگی ہوئی خس کی بھیگی ٹٹیاں، آنکھوں میں اور بدن میں ٹھنڈک اترنے لگتی۔ فرش پہ پہلے دسترخوان بچھتا، پھر اسی فرش پہ لیٹے لیٹے بڑی آپا اور تائی اماں اور امی اونگھنے لگتیں ''بی بی یہ بچے تو ذرا آنکھ نہیں

لگنے دیتے۔'' تائی اماں اونگھتے اونگھتے چونک پڑتیں۔ بڑی آپا بنی کو ڈانٹتیں ''اب تو سوئے گی نہیں؟'' اور تائی اماں زبردستی اچھے کو اپنی بغل میں لٹا لیتیں۔ ان کی آنکھیں پھر بند ہونے لگتیں۔ رفتہ رفتہ فرش پر لیٹے ہوئے سب لوگوں کو نیند آلیتی۔ بہت دیر بعد خراٹے لیتے لیتے بڑی آپا چونکتیں ''کیا بج گیا ضمیر؟'' ''ڈھائی۔'' اور بڑی آپا کی آنکھیں پھر بند ہونے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ تائی اماں کی آنکھ کھل جاتی۔ اسی طرح لیٹے ہوئے کنواڑ ذرا کھول کر باہر دیکھتیں ''دھوپ ہے ابھی تو'' اور غنودگی انہیں پھر آلیتی۔۔۔ پنکھا اسی ایک رفتار سے گردش کرتا رہتا، گردش کرتا رہتا، مگر پھر نوری کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگتے اور آنکھوں میں نیند اترنے لگتی۔ ایک جھپکی آئی، پنکھا بند، پھر آپ ہی آپ چونک پڑتی اور پھر پنکھا چلنے لگتا۔ بڑی آپا سوتے سے ایک ساتھ اٹھ کے بیٹھ جاتیں، کنواڑ کا ایک پٹ کھول کے دیکھتیں اور گھبرا اٹھتیں ''اے ہے دھوپ چبوتری پہ پہنچ گئی۔ ظہر کا وقت گزرا جا رہا ہے۔'' اور آہستہ سے کنواڑ کھول باہر نکل جاتیں۔

آنکھ اس کی لگتی اور کھل جاتی۔ تائی اماں اور بڑی آپا کی مانند نیند اسے کب آتی تھی۔ پہاڑ سا دن کٹنے میں نہ آتا اور لمبی دوپہر اور لمبی ہوتی چلی جاتی۔ باوا ایک نیند لیتے اور گاؤ تکیے کے سہارے آدھے لیٹے آدھے بیٹھے عینک آنکھوں پر لگا پھر کاغذات پڑھنے شروع کر دیتے۔ تحسینہ کروٹ لیتی، چوڑیوں کا ایک میٹھا مدھم چھناکا ہوتا، وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ امی آنکھیں کھول دیتیں۔ ''بیٹی تجھے دوپہر میں بھی قرار نہیں ہے گھڑی بھر کو تو آرام کر لیا کر۔''

''ممانی جی کلپ کل سے پڑا خراب ہو رہا ہے۔''

''ہاں کلپ بچے تو اسے بھی دھو دیجو۔'' امی لیٹے لیٹے دوپٹہ اتارتیں اور تحسینہ کو پکڑا دیتیں۔

بند اندھیرے کمرے میں لیٹے لیٹے اس کا دم الٹنے لگتا۔ آہستہ سے اٹھتا اور باہر نکل

آتا۔ تپش سے تپتا دالان دکھائی دیتا۔ کمرے کے دروازوں پر ٹنگی ہوئی پانی میں شرابور خس کی ٹٹیاں کہ پانی ان سے رس رس کر دالان میں بہتا ہوتا۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی ناند جس کے پانی میں اچھے اور بنی چھپا کے لگاتے نظر آتے اور پھر ایک ساتھ وہاں سے نکل جاتے کہاں چھو ہو جاتے۔ دالان کے بغلی در میں بیٹھی ہوئی تحسینہ۔ پاس خشکے کی پیچ سے بنا ہوا کلف دیگچی میں رکھا ہوا۔ اجلے میلے دوپٹے، صابون، پڑیاں اور کاغذ کی پڑیوں میں بندھے ہوئے رنگوں کے منجملہ ململ کی دھجی میں لپٹی ہوئی فیروزی رنگ کی ڈلی کہ اس سے نکلتی سنہری لہر دور سے چمک مارتی۔ تشلے میں کلف انڈیلنا اور دوپٹے کو خوب مل مل کر دھونا پھر کھنگال کر تشلے میں اجلا پانی انڈیلنا اور رنگ رنگ کی پڑیاں گھول کر دوپٹہ رنگنا، نچوڑنا، انھیں کھول کر جھٹکنا اور آنگن میں تنی ہوئی الگنی پر دھوپ میں پھیلا دینا۔ خربوزوں کے گودے سے بھری ہنڈیا اٹھا لانا اور گودے کو اتنا ملنا اتنا ملنا کہ بیج گودے سے الگ ہو جاتے۔ تب انھیں پیتل کی چھلنی میں ڈال کر پانی کا لوٹا اٹھا تڑیڑے دینا کہ وہ چاندی سے چمکنے لگتے۔ کچھ بیجوں کو ہرا رنگنا کچھ کو سرخ اور ان کے ہار گوندھ لینا۔

کچے دالان کے کسی کونے میں پٹ سے آواز ہوتی، دونوں چونک کر ادھر دیکھتے اور اسی دم اچھے اور بنی جانے کہاں سے ایک دم سے داخل ہوتے اور شور مچانا شروع کر دیتے ''تیلیا راجہ، باجی تیلیا راجہ۔۔۔ ضمیر بھائی دیکھو تیلیا راجہ۔'' واقعی جیسے تیل میں ڈوبا ہو، کالی چمکتی ڈلی سی۔ تیلیا راجہ بھن بھن کرتا دیوار سے ٹکراتا، ٹکرا کے زمین پہ ٹپ سے گری اور اپنے سوراخ سے تیز تیز مٹی کریدنا شروع کر دیتا۔ تیلیا راجہ کا ہنگامہ پرور ڈرامائی عمل ابھی جاری ہوتا کہ معطر بھٹکتی اور دالان کے بغلی در میں ایک بڑھیا آہستہ آہستہ رینگتی بھٹکتی دکھائی پڑتی، جو دالان سے نکل آنگن میں پہنچتی اور تیرتی تیرتی اوپر اٹھنے لگتی، یہاں تک کہ سامنے والی دیوار کی منڈیر کو چھوتی معلوم ہوتی ''بڑیا۔ بنی بڑیا۔''

اور اچھے اور بنی دونوں دالان سے نکل آنگن میں ہوتے ہوئے تیر کی طرح زینے میں داخل ہوتے اور گم ہو جاتے۔ پھر وہی بھائیں بھائیں کرتا دالان اور پھر وہ اور تحسینہ اکیلے۔ اکیلے لمحے جن کی وہ تمنا کرتا رہتا لیکن آئے پہ وہ کتنے سخت گزرتے، ایک گومگو کی کیفیت، دھڑ دھڑ کرتا دل اور تحسینہ اسی انداز سے گویا اسے کسی بات کی خبر نہیں گودے میں سنے خربوزے کے میلے گدلے بیجوں کو ملتی رہتی، ملتی رہتی مگر پھر آپ ہی آپ اس کی گردن پہ پسینے کے اجلے قطرے ابھرنے لگتے اور بیج صاف کرنے کا شغل ایک مشینی عمل بن جاتا، لگتا کہ اس کے ہاتھ اسی انداز میں اسی رفتار سے بیجوں بھرے گودے کو ملتے رہیں گے کہ اچانک وہ ہاتھوں کو تڑیڑے دیتی اور اٹھ کھڑی ہوتی۔ اٹھتے اٹھتے اسے اڑتی نظر سے دیکھتی، چلتے چلتے بظاہر سادگی سے کہتی "بہت تپش ہے، کیوں بیٹھے ہو گرمی میں یہاں؟" تپتے دالان میں بیٹھے رہنے کا کوئی عذر اس کے پاس نہ ہوتا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوتا اور کبھی اندر بڑے کمرے میں چلا جاتا اور کبھی باہر ہو لیتا۔

باہر جاتے جاتے اس نے عذر پیدا کیا۔ "تحسینہ۔"

تحسینہ ٹھٹھک گئی۔

"پیسے دے دو کچھ۔"

دالان سے نکلتے نکلتے وہ مڑی اور بغلی کمرے کی طرف ہو لی۔ پیچھے پیچھے وہ۔ پھر آہستہ سے اندر آ گیا، بغلی کمرے میں صندوق کے پاس جہاں وہ پیسے نکال رہی تھی۔ اجلے موتی سے قطرے گردن پہ پھر ابھرنے لگے اور گردن پر پڑے ہوئے اکاذ کا بال بھیگنے لگے اور ہاتھ جلدی جلدی کپڑوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ کپڑوں کے نیچے سے اس نے روپیوں کی صندوقچی نکالی، روپیہ نکال کے اسے دیا وہ لمبی گوری انگلیاں اس کے ہاتھ کے برابر آ گئیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ جیسے انھیں چھونا چاہتے ہوں، مگر پھر وہی رکاوٹ کی کیفیت، وہ صندوق بند کر آہستہ سے باہر نکل گئی۔

دہلیز میں وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑا رہا۔ دل اس کا آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا تھا۔ کھڑا رہا، پھر جی ڈھینے لگا۔ کمرے سے نکل کر دالان میں آیا کہ اب خالی تھا اور دالان سے سوتا ہوا باہر نکل گیا۔

سرخ پتھروں والا مندر دور سے آنچ دے رہا تھا۔ بہت اونچائی پہ اندھیری کھڑکی میں لگی ہوئی وہ لوہے کی چرخی کہ صبح و شام مسلسل گھومتی اور شور کرتی تھی اب شانت تھی۔ مندر والی گلی سے نکل پیاؤ کی گلی میں آیا۔ گلی سے نکل رہا تھا کہ لڑکوں کی ایک بے ہنگم ٹولی نے رستہ اس کا روک لیا۔ کالے کلوٹے لڑکوں کے اس غول میں گورے چٹے لڑکے بھی تھے۔ لیکن منہ پہ توے کی سیاہی مل کر سب ایک سے ہو گئے تھے۔ بعض نے بس قمیص اتارنا کافی جانا تھا بعض نے کہ بہت چھوٹے تھے۔ سب کپڑے اتار اپنے تئیں ننگا کر لیا تھا۔ کچھ نے کپڑے اتار لنگوٹ کہ ان کے جسم سے ہم رنگ تھے، کس لیے تھے۔ بیچ سڑک پہ کھڑے، ہاتھوں میں چھڑیاں اور چھوٹے چھوٹے ڈنڈے بجاتے شور مچاتے۔

''کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے''

کوڑی کھیت لگائے گا	برسے گا برسائے گا
کوڑی گئی ریت میں	پانی گیا کھیت میں

بیچ سڑک پہ کڑھی ہوئی تھالی، تھالی میں ایک دو اکنیاں، بہت سے پیسے کچھ دھیلے ہر آتے جاتے سے مطالبہ کہ تھالی میں پیسے ڈالو، دلیا پکائیں گے، مینہ کی دعا کریں گے۔
تھالی میں اکنی ڈالی تو لڑکوں نے رستہ چھوڑا اور وہ آگے بڑھا۔ مگر اب اس کے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔ قدم کہ رک گئے تھے مڑے اور آگے جاتے جاتے وہ پلٹ پڑا۔

شام کو دسترخوان پہ بڑی آپا کو پھر ضمیر کی فکر ہوئی۔ ''ارى تحسینہ ضمیر کو بلا کے لانا کہ کھانا

کھاؤ بھیا۔"

تحسینہ رکی، پھر رک کر قریب گئی "کھانا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

ایک اونگھ سی اس پہ طاری تھی اور سر مونڈھے کی پشت پہ ڈھلکا ہوا تھا۔ آنکھیں اسی طرح بند رہیں، آہستہ سے جواب دیا "بھوک نہیں ہے۔" چپ۔ پھر آنکھیں کھولیں، بولا۔

"طبیعت خراب ہے میری، کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

تحسینہ خاموشی سے مڑی اور واپس بڑے کمرے میں۔

اس کی طبیعت واقعی خراب ہوگئی تھی۔ امی نے اس کی پیشانی کو چھوا، اس کی کلائی کو دیکھا، بولیں "پنڈا گرم ہے۔"

تائی اماں کو امی کے اس بیان سے تشفی نہیں ہوئی۔ خود ماتھے اور گالوں کو چھو کے دیکھا، بولیں "بہو کیسی باتیں کرے ہے۔ لونڈا تو بخار میں بھن رہا ہے۔"

بڑی آپا نے اپنے طور ماتھے اور رخساروں کو چھوا، انگلیاں ماتھے پہ رکھیں، پھر پورا ہاتھ گال پہ رکھا، بولیں "بی بی، بدن تپ رہا ہے۔"

"میں تو جانوں لوں لگی ہے۔" تائی اماں بولیں۔

"اجی لوں تو لگنی ہی تھی۔" بڑی آپا کہنے لگیں "دوپہریوں میں مارا مارا پھرے ہے۔ برسوں میں بھتیجا آیا ہے پھوپھی کے پاس بیٹھتا، باتیں کرتا۔ مگر بہنوں وہ ایک دن میرے پاس آکے نہ بیٹھا۔ جنیں یا ہوگیا ہے پردیس جا کے۔ بہو تم کیوں لے آئیں اسے۔ اس کا جی نہیں لگتا یاں۔"

"بی بی پہلے تو ایسا نہ تھا۔" تائی اماں بولیں "جب یاں تھا تو ہر وخت بڑی آپا بڑی آپا کرے تھا۔"

"بہنوں وہ تو پردیس میں جا کے بدلا ہے۔" پھر بڑی آپا نے تحسینہ کو پکارا "تحسینہ، اری امیا ہے کوئی جلدی پنا بنا بھئے کے لئے۔"

بخار گرما کے آیا۔ شروع میں بے ہوشی ہوئی کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ ٹک ہوش آتا تو دھندلا دھندلا احساس ہوتا کہ ہاتھوں پیروں پہ مالش ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ پھر غنودگی آلیتی اور پھر وہی بے خبری۔

دو دن غفلت رہی، تیسرے دن ہوش آیا سو ساتھ اس کے بخار بھی ٹوٹنے لگا۔ پسینہ اتنا آیا کہ کرتا تر بتر ہو گیا اور بڑی آپا ماتھے اور گردن اور گلے کو آنچل سے پونچھتے پونچھتے تھک گئیں۔ حرارت البتہ اسی طرح باقی تھی۔ سر خالی خالی لگتا تھا اور زبان پہ اسی طرح کانٹے سے جمے ہوئے تھے۔

تائی اماں اور بڑی آپا اور امی دوپہر کی چند گھڑیاں جانے کس مشکل سے بڑے کمرے میں گزارتی تھیں۔ چھت میں لٹکے ہوئے جھالر والے لمبے پنکھے سے زیادہ انھیں نیم کی ٹہنیوں سے چھن کر آنے والی ہوا زیادہ بھاتی تھی۔ لو چلنے لگتی اور دھوپ کی تپش تیز ہو جاتی تو نیم کے نیچے سے اٹھ کر اندر جاتیں، لیکن ٹک دھوپ ڈھلی اور وہ پھر اپنی ٹھیک پر۔ سو دن ڈھلا تو وہ باہر نکل آئیں۔ مگر اس پر پابندی تھی کہ شام سے پہلے باہر نہ آئے۔ دروازہ اسی انداز سے بند تھا اور خس کی ٹٹی اس طرح پانی میں شرابور تھی۔ البتہ روشندان سے شعاع اک بہک کے اندر چلی آئی تھی اور کمرے کے اندھیرے میں ایک سنہری پارہ بھری لکیر تن گئی تھی جو پتہ دیتی تھی کہ سورج کا رخ بدل چکا ہے۔ نوری آدھی سوتی آدھی جاگتی ایک ہی رفتار ایک ہی انداز سے پنکھے کی ڈوری کھینچے چلی جاتی تھی کہ اس میں کبھی کبھی اس کے اونگھ جانے سے جھٹکا آتا اور ہوا کے بہاؤ اور کنڈوں کی گردش سے پیدا ہونے والے یکساں ترنم میں ایک پھندا پڑتا، پھر وہ فوراً چونک اٹھتی اور ڈوری کی گردش اور ہوا کا بہاؤ ان کنڈوں سے نکلنے والی آواز پھر اسی مقررہ ڈگر پہ آجاتی۔ تحسینہ نے اس کے سر میں کاہو کے تیل کی مالش زور زور سے شروع کی تھی مگر اب اس کی رفتار بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی اور گھنے گرم بالوں میں گردش کرتی ہوئی انگلیاں پنکھے

کی نیند بھری رفتار سے رفتار ملا کر آہستہ آہستہ سرسرا رہی تھیں، رینگ رہی تھیں، اس پہ نیم غنودگی کا عالم تھا، پچھلے دو دن غشی اور نقاہت کے گرم دھند میں ڈوبے ہوئے دن اب سپنے سماں ٹکڑے ٹکڑے کر کے یاد آتے جا رہے تھے۔ گورے پوروں میں تھرمامیٹر کی شیشے کی شفاف نلکی کہ اس کے ہونٹوں میں آ جاتی اور پھر وہ لمبی انگلیاں انھیں جھٹک کر بلند کرتیں اور آہستہ سے ایک چاندی سے چمکتے خول میں بند کر دیتیں۔ ہاتھوں اور پیروں پہ ہوتی ہوئی مالش کہ ایک ہی رفتار سے دیر تک جاری رہتی۔ یہاں تک کہ تلووں کو ملتی ہوئی نرم پوٹلی تھم جاتی اور تائی اماں کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چاندی کی چوڑیاں بجتیں اور خاموش ہو جاتیں یا کبھی کبھی اس کی ہتھیلی پہ گردش کرتی ہوئی نرم پوٹلی اور اس کے ہاتھ کو ہلکے سے تھامے ہوئے مخملیں میٹھی انگلیاں، ریشمیں شیریں چوڑیوں کے بلکوروں سے رستا ہوا نرم ترنم اور ایک خواب حواس پہ اس کے چھاتا ہوا، ایک شیریں غشی، ایک شہد آمیز نشہ، وہ شیریں خوابی کیفیت پھر جاگ رہی تھی۔ لذت سے لبریز ہلکی ہلکی بدلیاں حواس پہ پھر امنڈ رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ وہ نرم انگلیاں یونہی بالوں میں سرسراتی رہیں اور وہ یونہی آنکھیں موندے آدھ نیندی کیفیت میں ڈوبا رہے۔ نیند بھری کیفیت پھر طاری ہو رہی تھی اور اس کے اندر شہد سا گھل رہا تھا اور حواس پہ خواب کی ایک پتلی تہہ چڑھتی جا رہی تھی۔ بغیر کسی ارادے کسی نیت کے سیدھے ہاتھ کو اس کے حرکت ہوئی اور آہستہ سے سرہانے کی طرف بڑھ گیا۔ کاہو کے تیل میں ڈوبے ہوئے گھنے گرم بالوں میں رینگ کر انگلیاں اس کی گردش کرتی ہوئی گوری انگلیوں میں پیوست ہو گئیں۔ گردش کرتی ہوئی انگلیاں ٹھٹکیں، جہاں کی تہاں جمی رہ گئیں۔ جہاں کی تہاں جمی انگلیاں پگھلنے لگیں، بہنے لگیں۔ آگ نے آگ سے تپش پکڑی، گرم سیال رو انگلیوں سے انگلیوں میں منتقل ہوتی ہوئی، نشیب سے ابھر کر نشیب میں بہتی ہوئی، الگ الگ بہتی ندیاں امنڈ کر کناروں پہ سے بہہ نکلی تھیں، ایک

دوسرے میں بہنے لگی تھیں، گھل مل کر ایک رخ بہہ رہی تھیں۔ کالے لمبے بالوں کی گرم گھنیری سے نکل کر جکڑے ہوئے ہاتھ ہونٹوں کے قریب آ گئے۔ جلتی پگھلتی گوری گوری انگلیاں تپتے ٹوٹتے بخار والے تپتے کانپتے ہونٹوں کے پاس آ لگیں، ہونٹوں سے نکلتے گرم سانس میں بہہ نکلیں۔ مگر ایکا ایکی وہ بے قابو ہو کر اس گرم گرفت کو چھڑا کر نکلیں۔ وہ سرہانے سے ایک ساتھ، بڑبڑا کر اٹھی اور چل کھڑی ہوئی۔

دور ہوتے ہوئے قدموں کی چاپ کے ساتھ دروازہ عجلت میں کھلا اور بند ہو گیا۔ آنکھیں اس کی اسی طرح مندی ہوئی تھیں، مگر جو اس پر چھائی ہوئی خواب کی گہری گھٹا پھٹ گئی تھیں۔

(۴)

صبح آنکھ اس کی سویرے منھ اندھیرے کھلی۔ بڑی آپا ابھی نماز کی چوکی پہ تھیں اور ان کی پرسوز رقت بھری آواز مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی، صحن میں پھیل رہی تھی، رقت کی یہ کیفیت جیسے بڑی آپا کا جسم پگھل رہا ہو اور کوئی دم جاتا ہے کہ وہ بہے گا اور صبح کے پاکیزہ دھندلکے میں حل ہو جائے گا۔

گھر سے نکلنے پہ کہ آج بیماری سے اٹھنے کے بعد قدم باہر نکالا تھا اور نور کے تڑکے ٹہلنے چلا تھا اسے ساری فضا نئی نئی نظر آئی اور اجلی اجلی۔ لال مندر کہ جس کی بلند دریچے والی چرخی مسلسل گردش میں تھی، لمبی ڈوریوں میں بندھی ہوئی چھوٹی بڑی پیتل کی گڑویاں اور لوہے کی ڈولچیاں کہ تیزی سے نیچے چلتیں، کنوئیں کے اندھیرے میں گم ہو کر کھنکھناتیں اور پانی سے لبالب بوندیں ٹپکاتیں پھر اسی دریچے میں چھپ جاتیں۔ ٹھیٹھروں والی گلی جہاں ابھی دکانیں بند اور فضا شور سے پاک تھی۔ بس ایک بھنگن جھاڑو دیتی تھی، جس کی جھاڑو سے اڑتی ہوئی گرد نے گلی پر ایک نرم رو دھند کا غلاف چڑھا دیا تھا۔ گلیوں سے پرے بستی سے باہر جاتی ہوئی وہ سفید کنکروں کی گڈھوں والی پتلی سڑک بھی خاموش تھی جس پہ چلتے ہوئے پیر اس کے گٹوں تک خاک میں اٹ چلے

تھے اور بستی کی انتہا پر کھڑا ہوا سرخ اینٹوں والا موٹا مٹھس ستون، رات کی رخصتی کا نقیب
کہ اب گرمیوں میں یوں چپ تھا کہ دھوں اُگلنے اور منادی کا فرض گویا اسے پھر ادا ہی
نہیں کرنا پڑے گا۔ بستی کی انتہا کو اس نے چھوا اور پلٹ پڑا۔ قدموں کے نیچے سے نکلی
ہوئی سڑک پھر قدموں کی زد میں تھی، کبھی کنکروں کی کھردری زمین قدموں میں بجتی
ہوئی، کبھی ادھڑی سڑک جہاں کنکر غائب تھے اور قدم رکھنے سے خاک اڑتی تھی۔
اسکول والا باغیچہ نظر آنے پر سڑک سے اتر دگڑے میں آیا جہاں منوں مٹی تھی کہ پیر اس
کے دھنس دھنس گئے اور دگڑا پار کر کے اسکول کی صاف شفاف پگڈنڈی پر آگیا۔

وہ ایک خاموش شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ سرخ اینٹوں کے دروں کی وہ لمبی قطار وہ
برآمدہ کہ کھنچا چلا گیا تھا، دور سے دیکھنے پہ لگتا کہ یہ عمارت سے اَن گنت دروں اور ایک
لمبے برآمدے اور کھپریل کی جھکی ہوئی نیچی چھت کے سوا کچھ نہیں، مگر قریب آئے پہ
عمارت بلند ہونے لگتی اور پھیلتی چلی جاتی۔ اونچے اونچے در، اندر چمکتے شیشوں والے اَن
گنت دروازے اور دریچے گردا گرد پھیلی ہوئی فیلڈ جہاں کہیں کہیں سفید کھمبے کھڑے
تھے اور ہاکی اور فٹ بال کی فیلڈروں کی سرحدوں کا پتہ دیتے تھے۔ کلاسوں کے
دروازے مقفل تھے، برآمدے خالی اور فیلڈ خاموش، اسکول بند تھا۔ شہر، جس کے
دھومیں مچاتے آسمان سر پر اٹھاتے ننھے شہری سال کے سال ہجرت کر جاتے اور شہر
خالی اور سنسان ہو جاتا۔ ان دھوموں اور ان سناٹے دنوں سے اس کی آشنائی تھی۔
چھٹیوں کی صبحوں میں ابا میاں کے ساتھ بھونڑ کے کھیتوں میں گھومتے اکثر اس نے آنکھ
بچا کے رستہ کاٹا اور پھول توڑنے کی نیت سے اسکول میں پہنچا جب وہ اسکول کی
پست چہار دیواری کو پھاند کر اندر داخل ہوتا تو یہاں کی ہر چیز دیکھی چکھی اور برتی ہوئی
ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی بستی میں محسوس کرتا، جہاں کے باسی کسی
جادو کے اثر سے یا کسی دیو کے ڈر سے بستی خالی کر گئے ہیں۔ وہ فیلڈ کا چکر لگاتا، فیلڈ میں

کھڑے ہوئے سفید ستونوں کو چھو کے اور ہلا کے دیکھتا، خالی برآمدوں میں گھومتا، خالی برآمدے، بند دروازے، اکا دکا دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہوتا اور وہ جھانک کر نیم اندھیرے میں چمکتے ڈیسکوں اور کرسیوں کو دیکھتا، دیکھتا رہتا اور پیچھے ہٹ جاتا۔ کسی دروازے کا قفل غائب ہوتا اور دروازہ اک ذرا کھلا ہوتا۔ حیرانی اور ڈر کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس کے ہاتھ کنواڑوں کو آہستہ سے کھولتے۔ چپکے چپکے اندر جاتا۔ تعجب سے خالی فرش کو بند دریچوں کو ادھ کھلے روشندانوں کو دیکھتا۔ پھر دل اس کا دھڑکنے لگتا۔ باہر نکلتا اور بغیر پھول توڑے اس کی حدود سے باہر چلا آتا۔

ماضی کی مہک اسے پھر آنے لگی تھی اور بیتے دنوں کا جادو دل و دماغ میں جاگ رہا تھا وہ باغیچے میں ہو لیا۔ دھلے دھلے پودے اور جھاڑیاں۔ اجلے سفید پھول گویا سبزے میں چاندنی چٹکی ہے۔ تتلیاں کہ پودوں کو ہاتھ لگانے سے بے قرار ہوتیں اور ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو کر فضا میں بھٹکنے لگتیں۔ شبنم سے شرابور پتوں اور مہکتے پھولوں میں سفر کرتی انگلیاں ایک سفر پر نکل گئیں۔ انگلیوں کی گرفت میں، وہ شہد آمیز لمس پھر جاگ رہا تھا اور پوروں اور انگلیوں اور ہتھیلی میں میٹھی کن من ہو رہی تھی۔ پھولوں سے اس کا رومال بھر گیا تھا۔ اس نے رومال کو گانٹھ دی اور باہر نکل آیا۔

خاک سے اٹی سڑک۔ قدموں تلے بجتے ہوئے کنکر، پولی زمین، دگڑا، پگڈنڈیاں، کھیتوں کی مینڈھیں، پیر اس کے کبھی شبنمی گھاس کو روندتے ہوئے گیلے ہوئے کبھی دگڑے میں چلتے چلتے گرد آلود ہوئے۔ دور سے ہیرا کے الاپ لگانے کی آواز آ رہی تھی۔ تو بھونڑ کی حدیں شروع ہو چکی تھیں۔ کبھی پتلی پگڈنڈی پر، کبھی کھیتوں کی مینڈھوں سے گزرتا ہوا وہ نیم اور کھنڈال کے درختوں کے پاس جا پہنچا۔ اس نے نیم کی ٹہنی مسواک کی غرض سے توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا کہ ٹہنیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور گرگٹ ہرے پتوں سے نکل کر موٹے گدے پر آ گیا۔ ادھ ٹوٹی شاخ کو چھوڑ کر وہ ایک

قدم پیچھے ہٹا، گرگٹ پھولتا گیا، پھیلتا گیا۔ کانٹے سر کے اور پشت کے کھڑے ہو گئے اور منہ کی دہکتی ہوئی سرخی گردن میں، گردن سے پشت میں تیرنے لگی۔ دل اس کا دھڑکنے لگا، ایک مبہم سا ڈر کہ کوئی یورش ہونے والی ہے۔ رنگ زرد سے سرخ، سرخ سے ہرا ہوا۔ پھر اس کا رخ گھنی ٹہنیوں کی طرف ہو گیا۔ پیلی پیلی دم کچھ دیر تک اس جگہ ٹھہری ہوئی نظر آئی، پھر وہ بھی سٹک کر پتوں میں گم ہو گئی۔

ایک موہوم ڈر، اکیلے پن کا مبہم احساس، ذہن کے کسی گوشے میں ابھرتا دبتا وہم کہ جسم کا ایک پلی خون گھٹ گیا ہے۔ رخ اس کا پہلے کنوئیں کی طرف ہوا، پھر چلتے چلتے اس نے رستہ بدلا اور سیدھا گھر کی طرف ہو لیا۔ جہاں کبھی کالے پیلے دانوں والی جھاڑیاں، آکھ کے پودے سفید کانٹوں اور میلی پتیوں اور پیلے پھولوں والے ٹیڑھے میڑھے ببول کے درخت تھے اب اس میدان کی شکل بدل رہی تھی، جابجا سیمنٹ کے ڈھیر تھے اور سرخ اینٹوں کی دیواریں۔ کوٹھی کی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی، مگر آثار اس کے ظاہر ہونے لگے تھے۔

جب اس نے گھر میں قدم رکھا ہے تو اُجالا ہو چکا تھا اور سب سے اوپر والے کوٹھے کی ممٹی پہ سنہری دھوپ دمکنے لگی تھی۔ مگر بڑی آپا ابھی نماز کی چوکی پہ تھیں اور ان کی پرسوز رقت بھری آواز مولا علی وکیل علی بادشاہ علی صحن میں پھیل رہی تھی۔ تائی اماں دعا مانگتے مانگتے ابھی سجدے میں جھکی تھیں۔ امی اسی طرح سو رہی تھیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب پریشان کرتی مکھیوں سے مدافعت کی غرض سے دوپٹے کا آنچل ان کے چہرے پر آ گیا تھا۔ تحسینہ اٹھ بیٹھی تھی پر آدھی سوتی آدھی جاگتی۔ نیند کی ننھی بدلیاں چھنٹ کر پھر گھل مل رہی تھیں اور آنکھیں پھر مندنے لگی تھیں کہ اس نے بڑھ کر پھولوں کا رومال اس کی گود میں رکھ دیا۔ نیند کی ننھی بدلیاں آن کی آن میں غائب اور آنکھیں حیرانی اور استفسار کی غیر واضح کیفیت کے ساتھ اس کی طرف اٹھ گئیں۔

''پھول ہیں۔'' جواب میں بولا اور دل اس کا دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر دالان کی طرف ہولیا۔

دالان میں اور خالی کمروں میں مصروف بن کر وہ دیر تک گھومتا رہا۔ بڑے کمرے میں، بڑے کمرے سے بغلی کمرے میں، بغلی کمرے سے پھر بڑے کمرے میں۔

جب باہر آیا تو صحن اسے پھولوں سے اجلتا مہکتا معلوم ہوا۔ پھول نانی اماں کی چاندی کی بالیوں میں تھے، پھول بڑی آپا کے کانوں میں تھے کہ ابھی باورچی خانے کی طرف گئی تھیں۔ پھولوں سے تحسینہ لدی پھندی تھی کہ کانوں میں مہکتے گچھوں کے اثر سے رخساروں میں رنگ دوڑا ہوا تھا اور چہرہ کھلا پڑا تھا، پھولوں کے لیے۔ بنی ٹھنک رہی تھی کہ کانوں میں پہننے پہ قانع نہ تھی بلکہ ہار بھی چاہتی تھی۔

''بس اب اور پھول نہیں ہیں۔ تجھے تو ہاؤ کا ہوگیا ہے۔''

''باجی گجرا۔''

''ذرا سے تو رہ گئے ہیں۔ اس میں گجرا کیا بنے گا۔ کل پھر ضمیر بھائی لائیں گے تو پھر گجرا بنائیں گے۔ ہیں نا۔'' تحسینہ کی آواز میں پیار کے ساتھ ساتھ ایک لہک بھی تھی۔

بنی کو کل کے وعدے سے تسکین نہیں ہوئی۔ ''تمھارے پاس اتنے تو ہیں۔''

''کہاں اتنے ہیں؟ چار کلیاں رہ گئی ہیں۔'' اور اس نے پھیلے آنچل کو سمیٹ لیا۔

بنی پہلے ٹھنکی، پھر روٹھ کے منہ پھلایا، پھر بسورنے لگی اور جب تحسینہ پہ کوئی وار کارگر نہ ہوا تو اس پہ ٹوٹ پڑی۔ تحسینہ نے کہ اس نے آنچل پھر پھیلا لیا تھا اور اطمینان سے پھول گوندھ رہی تھی جلدی سے آنچل کو سمیٹا، بنی کے ہاتھ پکڑ کر پھول چھینے اور اسے پیچھے دھکیل کے ہنس پڑی ''باؤلی ہوئی ہے۔'' سر سے آنچل کاندھے پر کھسک آیا، جوڑے میں لگے ہوئے کئی پھول افشاں کی طرح چھٹ کے گرے اور ایک لٹ سرخ ہوتے گالوں پہ آپڑی۔ ''ایک دفعہ کہہ تو دیا کہ اب کل ہار بنائیں گے۔ مانتی نہیں۔'' وہ

پھر ہنس پڑی" بالکل وحشی ہے۔"

"تحسینہ سر ڈھکو۔" امی نے تہدید آمیز لہجے میں کہا۔

تحسینہ سناٹے میں آ گئی، سر ڈھکا، سینے سے سرکتے آنچل کو درست کیا، بالوں کی لٹ اوپر کی۔ امی نے پاندان اپنے پاس سرکایا، کھول کے پان لگانے لگیں۔

"تائی اماں پان کھاؤ گی؟"

"بس ایک کترا لگا دے بہو۔"

تائی اماں بولیں، امی پھر خاموشی سے پان لگانے لگیں۔ تحسینہ گم سم، اور بنی ششدر کہ بات کیا ہوئی اور خود وہ، پیشانی پہ پسینہ سکتے کی کیفیت، سوچ رہا تھا کہ امی نے تحسینہ کو نہیں اسے ڈانٹا ہے۔

"اجی ہم تو یہ جانیں ہیں۔" امی آخر بولیں" کہ جب تک ماں کے گھر رہے پھولوں کی صورت ماں نے نہ دیکھنے دی۔ چوری چھپے کبھی پھول مل بھی گئے تو کانوں کو چھپاتی پھرتی تھی کہ کہیں اماں نہ دیکھ لیں، خون پی لیں گی مگر اب تو پھول فیشن ہیں۔"

"ہاں۔" تائی اماں یاس بھرے لہجے میں بولیں" اب تو ڈو باہر عیب فیشن ہے۔"

"ہاں بے پردگی فیشن، سر کھلا رہے تو فیشن، نیچا گریبان فیشن، دیدے پھٹ گئے ہیں لونڈیوں کے۔ ہمارے زمانے میں ایسا کاہے کو تھا۔"

"تم نے تو کل ہوش سنبھالا ہے بی بی۔" تائی اماں کہنے لگیں" ہمارے زمانے میں تو ڈو با ایسا پردہ ہووے تھا کہ کیا مجال کہ غیر مرد آواز بھی سن لے۔ بڑی اماں، اللہ بخشے بڑی جنتی تھیں، سر کے بال سفید ہو گئے تھے مگر سقے نے کبھی ان کی پینچھل نئیں دیکھی۔ بی بی، ان دنوں تو باپ بھیوں سے بھی پردہ ہووے تھا۔ بنیاد علی جو ہیں ان کی ایک بہن تھی۔ بڑی بدنصیب تھی کم بخت نہ تو پھول کھلے نہ باپ بھئے کی صورت دیکھنی نصیب ہوئی۔ باپ باہر بیٹھا بیٹھا حکیم ڈاکٹروں کا انتظام کرتا رہا، بیٹی اندر دم توڑتی رہی۔

وہ جنتی صورت خاک کے پردے میں چھپ گئی۔ کیا اپنے کیا غیر کسی مرد نے جھلک اس کی نہ دیکھی۔"

تحسینہ خاموشی سے اٹھی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ بنی بھی کچھ حیران کچھ سہمی ہوئی اس کے پیچھے ہوئی۔

امی تحسینہ کو اٹھتے اور جاتے غور سے دیکھتی رہیں، جب وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئی تو ان کی نظریں پھر اپنے مقام پر واپس آ گئیں۔

"بی بی کوئی برا مانے یا بھلا مانے۔" اور امی کا چہرہ غصہ سے سرخ ہونے لگا "ہمیں ایسی بے حجابی پسند نہیں۔"

"برا ماننے کی اس میں کیا بات ہے۔" تائی اماں بولیں "کوئی غیر تو ہو نہیں، اور پھر ڈوبی بات کوئی ایسی نہیں کہی۔ بری بات دیکھی، ٹوک دیا۔ بڑوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے۔"

امی کہنے لگیں "تائی اماں میں تو ڈروں ہوں کہ کوئی بات الٹی نہ لے لی جائے۔ آخر سیانی لڑکی ہے، ایسا بھی کیا کہ نگوڑی نہ آنکھ میں حیا نہ چال میں حجاب، سر اور سینے کی سدھ نہیں، ایک آدھ دفعہ میرے جی میں آئی کہ کہوں بیٹی سیانی لڑکیاں کمر جھکا کے چلا کرتی ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ بھینا مجھے کیا، مفتی میں بری بنوں۔"

"خیر یہ تو بی بی تیری خواہ مخواہ کی بات ہے۔ اپنوں میں ایسی غیریت تو ہوتی نہیں ہے۔"

"تائی اماں اس میں غیریت کی بات نہیں ہے۔ کنواری لڑکی کا معاملہ نازک ہوتا ہے۔ ماں کی آنکھ اسے ٹھیک رکھتی ہے۔ بڑی آپا کے ہوتے ہم کون کہ ٹوکیں۔ ان پہ لازم ہے کہ وہ روک ٹوک کریں۔"

"اری وہ تو ابا میاں جب سے گزرے ہیں ایسی بے سدھ ہوئی ہے کہ کسی بات کو

دیکھے ہے نہ ٹوکے ہے۔"

امی چپ ہو گئیں۔ تھالی چھالیوں کی آگے کی اور چھالیا کترنے لگیں۔ پھر سوچتے سوچتے بولیں"اجی میں تو جانوں بڑی آپا کو اب بیاہ اس کا کر دینا چاہیے۔"

تائی اماں چپ رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں"بنیاد علی کا خط پھر آیا ہے۔"

امی چونکیں"اچھا؟ ذکر نہیں کیا بڑی آپا نے۔"

"ذکر کرے گی۔ اب کے تو ذکر کرے ہی گی۔"

"کیوں؟"امی کے کان کھڑے ہوئے۔

"اب کے انھوں نے ہاں اور ناں میں جواب مانگا ہے۔ اب ڈوبا کچھ نہ کچھ طے کرنا ہی پڑے گا۔"

چند لمحے امی اور تائی اماں دونوں چپ رہیں۔

تائی اماں پھر آپ ہی بولیں"ڈوبے وہ بھی سچے ہیں، آخر کب تک بیچ میں لٹکے رہیں۔ کرنی ہے تو کرو نہیں تو منع کرو۔"

"آخر سوچ کیا رہی ہیں بڑی آپا، کچھ پتہ تو چلے؟"امی بولیں۔

"بی بی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ابا میاں زندہ تھے سو ان کی موجودگی میں بنیاد علی کے بار بار خط آئے پر وہ چپ ہو جاویں تھے۔ چھموں ہے سو وہ چپ ہے۔ اسی چپ چپ میں دن گزرے جارئے ہیں اور لونڈیا کی عمر دن دن بڑھ رئی ہے۔"تائی اماں چپ ہوئیں پھر بولیں"اب بھیا آگیا ہے میں جانوں اس سے مشورہ لے گی۔"

"بھئے سے اور کون کون سی بات میں مشورے لیے تھے۔"امی کے لہجے میں اک ذرا گرمی آگئی۔

"اس معاملہ میں تو ضرور لے گی۔"تائی اماں چپ ہوئیں، پھر بولیں"ویسے ایمان کی بات ہے کہ ڈوبی کو بھئے سے محبت تو بہت ہے۔ اندر سے یہ تمنا بھی بڑی ہے کہ

بھتیے سے ملوں۔"

امی چپ۔ انھوں نے سروطہ تھالی میں رکھ دیا، کتری ہوئی چھالیاں ملیں، چار دانے ہتھیلی پہ رکھ کے منھ میں ڈال لیے۔ پھر آپ ہی آپ بولیں "بھئی بہن بھائی کا معاملہ ہے۔ میں بیچ میں بولنے والی کون، مگر منھ پہ آئی بات تو کہی جاوے ہے؟ میں یہ پوچھوں ہوں کہ جب تحسینہ کا امداد سے نام دھرا گیا تھا اس وقت بھی تو یہی بھیا تھا۔"

"ہاں یہ بھی تو تم سچ کہو ہو۔" تائی اماں بولیں۔ "مگر ایک بات یہ ہے بی بی کہ اس وقت لونڈیا کا باپ زندہ تھا، چھموں بے چاری کی کیا چلتی۔"

امی پھر چپ ہو گئیں۔ چھالیا کترتی رہیں، کترتی رہیں، پھر کہنے لگیں "تائی اماں بات یہ ہے کہ انھوں نے تو لونڈے پہ چھوڑ دیا ہے اور میں بھی یہی سوچوں ہوں۔ ہاں بھائی کل کلاں کو پسند نہ آئے تو ہمیں تانسے کہ تم نے مجھے جہنم میں جھونک دیا۔" امی خاموش ہو گئیں۔ مگر بات ان کی شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحے رک کر پھر بولیں، لیکن اس مرتبہ ان کی آواز بہت نیچی تھی، "تائی اماں، یہ لونڈیا اتنی ہوا توا کیوں رہوے ہے۔"

"اے اس کی ماں بھی ڈوبی ایسی ہی ہے۔" تائی اماں نے لاپرواہی سے کہا۔

"تائی اماں، یہ تو ہر وقت خفقانی سی رہوے ہے۔ جانے غریب کو کیا دکھ لگ گیا ہے۔ بڑی آپا ہماری ایسی باؤلی ہیں کہ کسی بات کی سدھ ہی نہیں۔"

تائی اماں نے ایک ساتھ پہلو بدلا "اے بیئے دھوپ آ گئی۔"

دھوپ پھسلتے پھسلتے چارپائی پہ آ گئی تھی۔

"اندر چلو" امی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "ضمیر چلو جا کے اندر بیٹھو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بغلی کمرے کی طرف ہولیا۔

دوپہر کو وہ کئی بار کمرے سے نکلا، کبھی پانی پینے، کبھی پیشاب کے بہانے، دالان میں آیا، دالان سے صحن میں، صحن سے پھر دالان میں۔ اس دوپہر کو دالان سنسان رہا، نہ

دو پٹے رنگے گئے نہ خربوزوں کے بیج دھلے۔

پھر اس کی آنکھ لگ گئی جب وہ اٹھا اور باہر آیا تو دھوپ ڈھل گئی تھی۔امی اور تائی اماں اور بڑی آپا سب کے سب باہر نکل آئے تھے۔

''ضمیر باہر آجاؤ،یاں ہوا ہے۔''بڑی آپا نے اسے آواز دی۔وہ دالان سے نکل نیم کے نیچے مونڈھے پہ جا بیٹھا۔

''اے چھموں تو نے ٹوک دیا۔ ہوا پھر بند ہوگئی۔'' تائی اماں کے ہاتھ میں پنکھا زور زور سے گردش کرنے لگا۔

ہوا واقعی بند ہوگئی تھی۔ضمیر کی قمیص پشت سے تر بتر ہونے لگی۔

''بھینا بڑی گرمی ہے،میرا تو پنڈا امروڑیوں سے پھل گیا۔''امی بولیں۔

تائی اماں بڑبڑانے لگیں'' توبہ توبہ آسمان تو تانبا ہوگیا۔ ڈوبی بھوبل برس رئی ہے۔''

پھر ان کا لہجہ بدلا اور گڑگڑا کے دعا مانگنے لگیں''الٰہی اپنے حبیب کے صدقہ پانی بھیج ... پانی ... کربلا کے پیاسوں کا واسطہ،پانی۔''

بڑی آپا کہنے لگیں'بھنوں' سنیں ہیں کہ نجومیوں نے بتایا ہے کہ اب کی برس پانی نہیں پڑے گا۔''

تائی اماں نے فوراً ٹوکا''نابی بی،ایسی آواز مت نکال۔اللہ رحم کرے۔''

امی بڑبڑانے لگیں''اجی ہم تو یہاں آکے آفت میں پھنس گئے۔ایسی گرمی کاہے کو دیکھی تھی ہم نے ساون گزر چلا اور بادل کا آسمان پہ نام نشان نہیں۔''

''اری بی بی'' تائی اماں کا تخیل بھٹکنے لگا۔''یہ کیا سوکھا ہے،سوکھا تو ایسی پڑی تھی... مگر ہمارا تمھارا تو پتہ بھی نہیں تھا،بڑی اماں سنایا کریں تھیں کہ ایسی سوکھا پڑی کہ برسات ساری گزر گئی اور بوند پانی کی نئیں پری،اساڑ اجاڑ،ساون سوکھا سوکھا،بھادوں

خالی، آسمان تانبا، زمین تڑخی جاوے، چڑیئیں گھونٹ کو ترسیں اور ڈنگر راتوں کو پیاس سے ڈکرائیں۔۔۔تو بی بی یہ سمجھو کہ اس برس دانہ نہیں اگا۔کال پڑ گیا۔۔۔سارے میں تراہ تراہ پڑ گئی۔ماؤں کم بختوں نے مٹھی بھر چنوں کے لیے گودیں خالی کر دیں اور اک اک نوالے کے لیے بیٹیں بہادیں۔۔۔وہ جانور کٹا وہ کٹا کہ بس توبہ ہی ہے۔چرند پرند جو ملا کاٹا اور کھایا۔۔۔اری بی بی، کوا تک عنقا ہو گیا۔

"کوئے بھی؟ اے تائی اماں کیا کہہ رہی ہو۔" بڑی آپا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔"ہاں بی بی کوئے۔۔۔" تائی اماں کی آواز میں دہشت کی ایک کیفیت پیدا تھی۔" کوئے۔۔۔ بی بی کال تھوڑا ہی تھا عذاب الٰہی تھا۔کال ٹلا تو غدر ٹوٹ پڑا۔ چوریں ہوئیں، پھر ڈاکے پڑے۔روز خبریں آویں کہ آج فلاں محلے میں کومل لگ گیا، آج فلاں گاؤں میں ڈاکہ پڑ گیا۔اے میاں اسی میں غدر مچ گیا۔خلقت ہل گئی۔وہ گولہ بارود چلا کہ کھڑی حویلیئیں زمین کا پیوند ہو گئیں اور حویلیوں والوں کو سر چھپانے کو جگہ نہ ملے اور میاں دلی میں تو وہ رن پڑا کہ بڑی اماں کیویں تھیں کہ دلی کے کنوئیں خاک سے اٹ گئے اور جمنا سرخ ہو گئی۔"

تائی اماں چپ ہو گئیں۔ بہکتے بہکتے جانیں کون سی دنیا میں جا نکلی تھیں کہ آواز بھی ساتھ ان کا چھوڑ گئی تھی۔بڑی آپا گم سم، آنکھوں میں دہشت کی کیفیت، امی بھی چپ مگر پھر امی نے پہلو بدلا اور تائی اماں کے پورے ہوئے جادو کے جالے سے نکلنے کی کوشش کی" اجی خیر دلی کا کیا ذکر ہے۔اس شہر کو تو کسی فقیر کی بد دعا لگ گئی۔ بار بار اُجڑے ہے۔ بار بار بسے ہے۔"

تائی اماں اس کو تکتی رہیں وہ خود بھی تو اپنے پورے ہوئے جالے میں گھری ہوئی تھیں۔پھر انھوں نے پنکھا اٹھایا، جھلنے لگیں، پھر بڑبڑائیں" فقیر کی بد دعا کہہ لو یا اعمالوں کی سزا، ہم تو یہ جانیں ہیں کہ بائیس خواجہ کی چوکھٹ میں کوئی راجہ سو برس سے زیادے

تخت پہ نئیں بیٹھا، سو برس بعد راج بدلے ہے، رعایا بلے ہے۔"

"اللہ تیرا شکر" بڑی آپا کی باچھیں کھل گئیں۔ نیم کے پتوں میں سراسراہٹ ہوئی تھی۔ اور جلتے تپتے بدنوں کو ہوا کے ایک ہلکے جھونکے نے چھوا تھا۔ ڈھلتی دھوپ سے تپتے آنگن میں اچانک چھاؤں اتر آئی۔ دھوپ پیروں چلنے لگی، جلدی جلدی سامنے کی دیوار پر چڑھی، منڈیر پر پہنچی، اونچے کوٹھے والی ممٹی پہ سرکتی نظر آئی اور اوجھل ہوگئی۔

"اللہ پانی بھیج۔" بڑی آپا کی حسرت بھری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

ننھی گدلی بدلیاں جلتی بلتی فضا میں بھٹکتے بھٹکتے قریب ہوگئی تھیں اور گھل مل گئیں تھیں۔ گھلی ملی بدلیاں بلندی پہ رینگتی رہیں، تیرتی رہیں اور سوکھے آنگن میں شادابی کی رو دوڑنے لگی۔ گھلی ملی بدلیاں پھر چھٹنے لگیں اور دھوپ پلٹی، ممٹی پہ نمودار ہوئی، منڈیر پہ آئی، دیوار دیوار اتری اور آنگن میں پھیل گئی۔

دروازے کے باہر کھڑ کھڑ کرتا اکا رکا۔

"اِکہ کس کا آیا؟" بڑی آپا چونکیں۔

"ضمیر۔" امی اس سے مخاطب ہوئیں "دیکھو کس کا اِکہ آیا۔" پھر بڑی آپا بولیں "میں جانوں تمھارے بھئیے آگئے۔ مقدمہ تو آج ختم ہوگیا۔"

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلا۔

بڑی آپا دھڑکتے دل سے دعائیں مانگ رہی تھیں "الٰہی خیر، اچھی خبر آئی ہو۔"

دروازے پہ پہنچا تو باوا اکے سے اتر پڑے تھے۔ کھچڑی بالوں میں اور لباس پہ گرد کی ہلکی تہہ، چہرے سے سفر کی تھکن ظاہر، اکے والے کا حساب چکایا، بستہ اتروا کر نوکر کے سر پر دھرا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتے اندر چلے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے۔ آنگن میں قدم رکھا تو گھر بھر کی نگاہیں، آس و یاس میں بٹی ہوئی سوال کرتی نگاہیں، ان کی طرف اٹھ گئیں۔ باوا نے جیب سے رومال نکال کر کپڑے جھاڑے، چہرہ صاف کیا،

گردن پہ بہتے پسینے کو پونچھا اور مونڈھے پہ بیٹھ گئے۔ بڑی آپا مونڈھے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں اور زور زور سے پنکھا جھل رہی تھیں۔

''بھیا کیا ہوا؟'' تائی اماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ آہستہ سے بولی'' ڈگری ہو گئی۔''

''ڈگری۔۔۔۔''

تیزی سے پنکھا جھلتا ہوا ہاتھ ایک ساتھ رک گیا۔ رک کر پھر چلنے لگا، مگر آہستہ آہستہ کئی منٹ تک خاموشی رہی، پنکھا بڑی آپا کے ہاتھ میں باوا کے سر پر آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا۔ پھر باوا اٹھے اور غسل خانے کی طرف چلے گئے۔

وہ نہا دھو کر وہی روزمرہ والا چارکانے دار تہمد باندھے سفید بنیان پہنے غسل خانے سے نکل مونڈھے پہ بیٹھے اور حقے کی نے کو جو ابھی تازہ کر کے مونڈھے کے سامنے رکھا گیا تھا، ہونٹوں میں دبایا۔ بڑی آپا اور تائی اماں اور امی اسی طرح گم متھان بنی بیٹھی تھیں۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ چھاؤں اور ہلکا ہلکا چھڑکاؤ، جس نے زمین میں دبی ہوئی گرمی کو ابھار دیا تھا اور گیلے آنگن سے ابخرات نکل رہے تھے۔ باوا نے حقے کی نے کو ہونٹوں سے الگ کر کے اسے جڑ سے تھاما اور فاصلے سے رکھ پھر ہونٹوں میں دبا لیا۔ وہ تھکن اور پریشانی کہ اِکے سے اترتے وقت بشرے سے عیاں تھی ڈھل سی گئی تھی۔ شاداب حقے کی سوندھی خوشبو اور خواب آور گڑگڑاہٹ کے ساتھ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ حقے کی گڑگڑاہٹ، باوا کی بند آنکھیں، بڑی آپا اور امی اور تائی اماں کہ گم سم بیٹھی تھیں۔ خاموشی اتنی کہ اس کا دم بند ہونے لگا۔ بار بار ضمیر نے ارادہ کیا کہ وہ آہستہ سے اٹھے اور دبے پاؤں باہر نکل جائے۔ مگر اس کا حوصلہ نہ ہوا۔ ایک دفعہ اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ دبے پاؤں سادم بند فضا سے نکل جائے کہ اتنے میں سکیوں کی آواز آنے لگی۔ بڑی آپا بہت دیر سے دم سادھے بیٹھی تھیں، بند ٹوٹ گیا اور وہ گھٹنوں میں سر دے

کے آہستہ آہستہ رونے لگیں۔ باوا نے آنکھیں کھولیں، بڑی آپا کو دیکھا اور پھر بند کر لیں اور حقے کی گڑ گڑاہٹ اسی ہموار رفتار کے ساتھ بلند ہونے لگی، ہوتی رہی۔

اس رات حویلی والے سویرے سوئے، بڑا والا لیمپ کہ کبھی آنگن میں کبھی چھت پہ کبھی کمرے میں رات گئے تک جلتا رہتا تھا اور باوا اس کی روشنی میں بڑے ابا کے بوسیدہ بادامی کاغذات الٹتے پلٹتے رہتے تھے، شام ہی سے مندا کر دیا گیا تھا۔

گلی سے گزرتے نکلتے لوگوں کو گمان ہوا کہ حویلی والے آج کسی تقریب پہ گئے ہیں۔

(۵)

اساڑ اُجاڑ، ساون سوکھا اور اب بھادوں گزر رہا تھا۔ آسمان پہ کبھی کبھی بادلوں کے دل کے دل چلتے نظر آتے، بے مقصد بے منزل، بادلوں کے قبیلے رینگتے رہتے، رک کر کھڑے ہو جاتے، پھر رینگنے لگتے، بادل جانے کدھر سے بھٹک بھٹک کر آتے، ٹوٹے پھوٹے بادل، بادلوں کی پھٹکیں، پھٹی ٹوٹی روپہلی بدلیاں، اکا دکا میلے بھورے اور آہستہ آہستہ آپس میں پیوند ہونے لگتے اور سورج پہ ایک باریک نقاب پڑ جاتا اور دھوپ کھیتوں اور میدانوں میں جلدی جلدی چلتی ہوئی درختوں کو پھلانگ کر اوٹ میں جا چھپتی۔

''آج تو بادل آئے ہیں۔'' کوئی راہ گیر چلتے چلتے کہتا۔

گندل آسمان کو دیکھتا، پھر روکھے لہجے میں کہتا ''برسنے والے نہیں ہیں۔''

میلے اجلے بادلوں کے قبیلے بے گرجے بے برسے گزر جاتے اور آسمان پھر خالی خالی نظر آتا۔

''ٹیٹری بول رئی ہے، مینہ آئے گا۔'' چیختی ہوئی ٹیٹری کی آواز پر تائی اماں امید بھرے لہجے میں کہتیں۔

''تائی اماں'' بنی پوچھنے لگتی ''ٹیٹری چیختی کیوں ہے؟''

''بیٹی پانی مانگے ہے، بادلوں کو پکارے ہے۔''

''تو بادل اسے پانی پلاوے ہیں؟'' اچھے کا تخیل بھٹکنے لگتا۔

''ہاں بیٹا، ڈوبی بدنصیب ہے۔ بھئے کو پانی نئیں پلایا، ایسی بددعا لگی کہ ٹیٹری بن گئی چونچ میں پانی کا قطرہ نہیں جاتا۔ دماغ میں چھید ہے۔ بوند پڑے ہے تو دماغ کے رستے حلق تر ہووے ہے، پھر پیاسی کی پیاسی۔''

ٹیٹری پانی مانگتی رہتی۔ بادلوں کو پکارتی رہتی۔ ٹیٹری کبھی ٹکا ٹیک دوپہری میں ٹٹکارتی کبھی رات کے سناٹے میں پکارتی۔ بوند پانی کی بہر صورت نہیں پڑی، جلتی دوپہریاں گرد سے اٹ گئیں اور تارے کہ راتوں کو جگمگاتے تھے اب میلے میلے دکھائی دیتے۔ برسات نہ برسات کے تحفے، ساون کی جھڑی نہ بھادوں کی بھدبھدی، نہ ساون کے بسنتی سندوری آم کہ پچھلے برس ٹکے دھڑی بکے تھے نہ بھادوں کی جامنیں۔ گیلی زمین سے اٹھتی ہوئی سوندھی باس نہ پیچ پیچ کرتے گھوروں سے آتی ہوئی بساند۔

روز صبح کو کہ کبھی بالکل مٹیالی ہوتی اور کبھی ہلکی میلی اٹھنا اور بھونڑ کی رطف نکل جانا۔ آگے آگے باوا پیچھے پیچھے وہ۔ کھیتوں میں قدم رکھا کہ گندل اچانک سے، کبھی کسی درخت کے پیچھے سے، کبھی پگڈنڈی پہ چلتا ہوا آتا، قریب آ کر آہستہ سے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا۔

''سرکار کریلا جل گیا'' گندل اور ہیرا کنواں سارے سارے دن چلاتے، راتوں کو چلاتے، گجر دم اٹھ کر چلاتے۔ ٹیٹری کی پکار اور ہیرا کی تان پھنکتی دوپہروں اور سناہتی راتوں میں سنائی دیتی، صبح کا گجر بجتا تب سنائی دیتی اور جب دھوپ ڈھل کر پگڈنڈیوں پہ سرکنے لگتی تب سنائی دیتی مگر زمین پیاسی رہی اور لوؤں اور آندھیوں کا زور قائم رہا۔

گندل روز کسی فصل کے جلنے کی خبر سنا دیتا۔

''سرکار۔۔۔ مکی اجڑ گئی۔۔۔ کل سرخ آندھی آئی تھی۔''

باوا نے خاموشی سے عینک درست کی، کھنکارے، آہستہ سے بولے "اچھا" اور کنوئیں کے پاس سے نکل کر کھیت کی پگڈنڈی پر ہو لیے۔

"بی بی میں نے دالان سے جھانک کے دیکھا، آسمان سرخ، خون کی بوئی، منڈیریں اور دوالیں لال لعبو۔"

بڑی آپا کہ دہشت کی کیفیت ان کی صورت اور لہجے دونوں سے ظاہر تھی بولیں "تائی اماں ہماری عمروں میں تو ایسی آندھی کبھی نہیں آئی۔"

"نا بی بی، ہم نے نہیں دیکھی۔" تائی اماں بولیں "بڑی اماں ضرور سنایا کرتی تھیں کہ غدر سے پہلے ایک دفعہ آئی تھی۔ ایسی سرخ کہ آسمان مانو خونم خون ہو گیا اور دوالیں اور منڈیریں اور ممٹیں جیسے کسی نے سرخ پڑیا مل دی ہو۔"

"بہنوں ہم تو یہ جانیں ہیں۔" بڑی آپا کے لہجے سے دہشت کی کیفیت مٹ گئی تھی اور دکھ کا رنگ پیدا ہو چلا تھا "جب سے اس بخت ماری کوٹھی کی نیم کھدی ہے روز ایک آفت ٹوٹتی ہے۔" تائی اماں نے فوراً تائید کی "یہ تو سچ کہوے ہے چھموں۔ ابا میاں کے سامنے جب شبیر حسین نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا تو انھوں نے صاف منع کر دیا تھا کہ ہم اس زمین کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ اس پر اثر ہے آباد نہیں ہو سکتی۔"

"تائی اماں آپ ہیں بڑی شکی۔" امی بولیں "بھئی یہ تو وقت کی بات ہے۔ کام بنتے بھی ہیں بگڑتے بھی ہیں۔ سنور جائے تو کہہ دو نصیب در ہے۔ بگڑ جائے تو اثر بتا دو۔"

تائی اماں نے فوراً جواب دیا "بہو تو تو ہماری کسی بات کو مانتی ہی نہیں، نہ تیرا میاں مانے اچھا بی بی ہم ہی بے وقوف ہیں۔" تائی اماں چپ ہو گئیں۔

بڑی آپا کا ذہن بھٹک کر کسی اور طرف جا نکلا۔ سوچ بھرے لہجے میں بولیں "ابا میاں اور ان کے ساتھ کوئی اور۔۔۔ ایک خیال کہ میر بو علی ہیں۔ ابا میاں اور بڑے ابا پریشان سے ہیں۔۔۔ پھر جیسے میر بو علی چلائے ہوں۔۔۔ حویلی کی ڈاٹ پھٹ گئی۔۔۔

بس میری آنکھ کھل گئی۔۔۔۔"

تائی اماں ہل سی گئیں، کچھ دیر تک گم سم خلا میں تکتی رہیں۔ پھر پہلو بدلتے ہوئے ٹھنڈا سانس لیا، بولیں" بعضا خواب تو سچ مچ عین مین سچ ہو جاوے ہے۔"

تائی اماں خاموش ہو گئی تھیں، لیکن جب کوئی اور نہ بولا اور امی اور بڑی آپا گم متھان بنی بیٹھی رہیں تو پھر بول پڑیں، مگر اب کے ان لہجے میں تلخی بھی تھی۔" اب اوٹھسیں کو ٹھسیں بناتے رہو، حویلی تو ٹھکانے لگ گئی۔"

بڑی آپا نے جواب میں ٹھنڈا سانس بھرا، بولیں" ہاں وہ تو ٹھکانے لگ گئی۔" اور چپ ہو گئیں۔ کوٹھی کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ تھانے کچہری کا قصہ ختم تھا، ابا میاں کے رقعے پرچے احتیاط سے باندھ کر پھر کتابوں کے بھرے لکڑی کے صندوق میں ڈال دیے گئے۔ اب باوا کا سارا سارا دن بھونڑ پر گزرتا۔ امی نے ضمیر کو بھی اس الجھیڑے میں پھنسا دیا۔" اجی تم اکیلے کہاں تک سارے کام کی دیکھ بھال کرو گے۔ اپنی عمر کو دیکھو۔ ذرا گرے تو کھٹیا سے ایسے لگو گے کہ اٹھانہ جائے گا۔ ضمیر گھر میں بیٹھا کیا کرتا ہے کیوں اس سے نہیں کہتے کہ کام کی دیکھ بھال کرے۔" گھر میں وہ بیٹھتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔ دو پہری بھر دالان بھائیں بھائیں کرتا اور آنگن تپتا رہتا اور نیم کی ٹہنیاں کبھی تھکے تھکے ہلکورے لیتیں اور کبھی سر نیوڑھا کر چپ ہو جاتیں۔ تحسینہ تھی گھر ہی میں کبھی دالان میں کبھی آنگن میں کبھی کیاری پہ، دور سے جھلک نظر آئی اور اان کی آن میں اوجھل، امی تھیں کہ ہر وقت اسے نظروں میں رکھتیں۔ اٹھتے بیٹھتے اسے احساس رہتا کہ امی کی نظریں ساتھ ہیں اور تعاقب کر رہی ہیں۔ گھر سے خفقان ہونے لگا مگر باہر بھی سکون تو نہیں ملا سیمنٹ کی جا بجا ڈھیریاں روڑیوں کے سرخ سرخ ڈھیر بھیگا گارا جہاں سے راج بھر بھر پرا نتیں سر پر رکھ ادھ بنی دیواروں کی طرف جاتے۔ سیڑھی چڑھ مچانوں پہ پہنچتے اور پرا نتیں خالی کر کے پلٹ آتے اور وہ سرخ اینٹوں سے لدے گدھے کہ ان کے لد

پھند کر جانے کا تانتا دن بھر بندھا رہتا۔ لگتا کہ کوٹھی نہیں شہر تعمیر ہو رہا ہے۔ گدھوں کے آتے جاتے قافلے، روڑیاں کٹنے اور آریوں اور آروں کے چلنے کا ترنم، راج مزدور، اٹھتی اونچی ہوتی دیواریں، یہ ساری چہل پہل اس کے تئیں ایک بہنگم شور تھا، ایک بے سمت سرگرمی۔

''ضمیر میاں، سردلیں کیسے بنیں؟''

''کیوں؟''

بوڑھے بڑھئی نے عینک درست کی، بولا: ''کل جو لکڑی آئی تھی، غائب ہے۔''

''لکڑی غائب؟''

لکڑی کس نے غائب کی، ایک ایک سے پوچھا گیا، ڈانٹا گیا۔ راج مزدور کام چھوڑ چھوڑ گرد اس کے جمع ہوئے اور لگے ایک دوسرے کو تہمت لگانے۔ پھر باوا آئے شور کرتے۔ مزدور ایک دم سے چپ ہو گئے۔ انھوں نے سیدھے سیدھے سوال کیے۔ ایک راج نے اکھڑے اکھڑے جواب دیے۔ شک پڑا، اسے نکال دیا۔

سردلوں اور چوکھٹوں کی لکڑی غائب ہوئی۔ پھر اینٹوں پہ گمان گزرا کہ کم ہیں۔ پھر سیمنٹ کی چند بوریاں گم ہوئیں۔ جس کسی پہ شک پڑا، نکال باہر کیا۔ چوری کا سلسلہ جاری رہا اور راجوں کو نکالنے کا سلسلہ لمبا ہوتا گیا۔ لیکن راج مزدور وہی تھے۔ ایک تھیلی کے چٹے بٹے۔ نکالے ہوئے راج پھر کام پر آنے لگے۔ پھر نکالے گئے، پھر کام پر لگے اور برائی کا ایک چکر قائم ہو گیا۔

''کام اب تک شروع نہیں ہوا؟ کہاں ہیں راج؟''

''ضمیر میاں، خزانہ؟'' ایک راج نے پراسرار لہجے میں دبی زبان سے کہا۔

''کیسا خزانہ؟''

''اجی برآمدے کی نیم کھودتے کھودتے چھنا کا ہوا۔ سب کھود رہے ہیں اسے۔۔۔

خزانے نکلے گا۔"

راج سارے کے سارے دن بھر کھدی ہوئی نیم کو کھودتے رہے، گہرا کرتے رہے۔ جنہوں نے کھدائی میں حصہ نہیں لیا وہ امید و بیم میں بٹے وہاں بیٹھے رہے اور ہر ضرب پہ حیرانی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ شام کو کھلا کہ کانسی کا دیگچا ہے، کوئلے اس میں بھرے ہیں۔

"اشرفیں کوئلے بن گئیں۔" تائی اماں افسوس بھرے لہجے میں بولیں "اجی قسمت کی بات ہے اور بی بی نیت کا بھی معاملہ ہووے ہے۔ میں تو جانوں کسی راج کم بخت کی نیت میں فرق تھا۔"

راجوں کی نیت کا فرق قائم رہا اور تعمیر کے ساتھ خرابی کی صورت چلتی رہی۔

راجوں کے بہنگم شور سے اس کا دل الٹنے لگتا اور وہاں سے ہٹ کر کنوئیں کے پاس بڑ کے پیڑ کے نیچے آجاتا۔ گندل کی پکار "ہیرا، اوئے ہیرا۔۔۔ ہیرا ہوت۔"

"ہمبے۔"

"اوئے چھوٹے میاں آیوں ہیں، کھاٹ ڈال دے۔"

"آیا۔"

ہیرا پگڈنڈیوں سے چلتا لپک جھپک آتا۔ چارپائی بچھ جاتی۔ بڑ کے گھنے سائے میں لیٹ کر اسے کتنا سکون ملتا۔ گندل راکھ میں دبا ہوا اُپلا کریدتا، چمٹے سے توڑ کر چلم بھرتا اور پائنتی کے سہارے بیٹھ چلم پینے لگتا۔

"ضمیر میاں۔" ہیرا بولا۔

"ہوں۔"

"یہ کوٹھی کب تک بنو گی؟"

"بن رہی ہے۔ بن ہی جائے گی۔"

"تو وا کے بعد سگرے حویلی والے یاں پہ آجاویں گے؟"

"اور کیا؟"

"اور حویلی خالی ہو جاوے گی؟"

"خالی؟ ہاں۔"

گندل نے چلم پیتے پیتے آنکھیں کہ بند ہو چکی تھیں کھولیں، کھنکارا، چلم ہیرا کی طرف بڑھادی۔ آنکھیں پھر مندنے لگیں۔ گنگنانے لگا۔

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایو کھائے

ہیرا جنم امول تھوکوڑی بدلو جائے

اس کی آنکھیں بھی بند ہونے لگی تھیں اور بیٹھی بیٹھی غنودگی آنکھوں میں آنکھوں کے راستے پورے بدن میں اترنے لگی تھی کہ منشی جی کی آواز نے چونکا دیا۔

"ضمیر میاں۔" منشی جی کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "کیوں؟"

"کوئیا سوکھ گئی۔"

"کوئیا سوکھ گئی؟" وہ حیران رہ گیا۔

"جی۔" منشی جی بولے۔ "کوئیا سوکھ گئی۔ اب پانی کہاں سے آوے۔ کام رکا پڑا ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے کوئیا کے پاس گیا کہ جہاں مزدور سارے کام چھوڑ چھوڑ کر جمع تھے، کچھ کوئیا کو جھانک جھانک کر دیکھتے تھے، کچھ نے ٹولیاں بنائی تھیں اور درخت کے سائے میں بیٹھے حقے پیتے تھے، اینڈتے تھے، وہ اٹھا اور گھر کی طرف ہولیا۔

بڑے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو باوا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں اور بڑی آپا بے ساختہ بولیں "اے ہئے ایسی دھوپ میں مارا مارا پھرے ہے۔ دیکھو تو

سہی منھ سرخ ہو رہا ہے۔"

باوا بڑی آپا کی بات کو نظر انداز کر کے اسے انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

"کیوں؟"

"کام رُک گیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟" باوا نے پھر اسی نیم استعجابیہ لہجے میں سوال کیا۔

"کوئیا سوکھ گئی۔"

"کیسے؟" بڑی آپا چونک پڑیں۔

بڑی آپا کا سوال بے جواب رہا۔ وہ بولنا چاہتا تھا لیکن باوا کے تیور دیکھ کر چپ ہو گیا۔ باوا خاموشی سے اٹھے، کپڑے درست کیے، جوتا پہنا، باہر ہو لئے۔

باوا کے باہر جانے پر سکتہ ٹوٹا، تائی اماں نے پھریری لی "اے ضمیر کوئیا سچ مچ سوکھ گئی کیا؟"

"جی تائی اماں۔"

"کیسے سوکھ گئی؟" بڑی آپا نے سوال کیا۔

"گرمی سے۔"

"گرمی سے؟" تائی اماں کے لہجے میں طنز کا رنگ تھا۔ "گرمی سے کہیں کنوئیں سوکھا کریں ہیں۔ آخر رہٹ کا کنواں بھی تو ہے، دن رات چلے ہے ڈوبا، وہ کیوں نہ سوکھا؟"

"تائی اماں۔" وہ کہنے لگا۔ "یہ کوئیا تو تھوڑے دنوں کے لیے کھدوالی تھی۔ کچی تھی اتھلی تھی۔ دھوپ سخت پڑی، سوکھ گئی۔"

وہ بڑبڑائیں "ہاں اب جو جی چاہے کہہ لو۔" اور چپ ہو گئیں۔

بڑی آپا چپ تھیں۔ امی بھی۔

پھر امی نے جماہی لی، بولیں "ڈوبی کوٹھی تو ایسی کھٹائی میں پڑی ہے کہ بن ہی نہیں

چلتی روز کوئی کھنڈت پڑ جاوے ہے۔"

بڑی آپا اسی طرح چپ تھیں۔ تائی اماں چپ تھیں۔ تائی اماں چپ رہیں، پھر بڑی آپا سے مخاطب ہوئیں۔"چھموں تجھے یاد ہے جب پیر جی والوں کا گھر بن رہا تھا؟"

"ہاں۔" بڑی آپا نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا اور پھر خیال میں ڈوب گئیں۔

"بڑی دھوم سے خریدی تھی زمین۔" تائی اماں شروع ہو گئیں "وہ شیخنیں کہ اللہ کی پناہ جیسے نرالا انھیں کا گھر بن رہا ہے نیم کھدی۔ اسی دن کو یا کھدی۔ پیر جی نے بھر بھر دونے نکلتیاں بانٹیں۔ برادری کا ایک ایک بچہ گیا۔ نکلتیں کھائیں، بھر بھر گلاس پانی کو یا کا پیا۔ پانی ڈوبا ایسا ٹھنڈا اور میٹھا کہ کیا بتاؤں۔" چپ ہوئیں پھر شروع "بی بی، تیسرے دن صبح کا جو سقہ ڈول ڈالے ہے تو ڈول کھٹ سے زمین میں جا کے لگا۔ کو یا سوکھی۔"

بڑی آپا تائی اماں کا منہ تکنے لگیں۔

امی ٹھہر کر بولیں "اجی تائی اماں نیت کا بھی تو پھل ملے ہے۔ یہ ڈوبے پیر جی والے ہیں بھی تو اوچھے۔"

"یہ تو سچ ہے بہو۔" تائی اماں بولیں۔"مگر بعضی بعضی زمین بھی ایسی ہووے ہے کہ آباد نہیں ہوتی۔ اب یہ دیکھ لو کہ پیر جی نے لاکھ کوشش کی، دوسرا کنواں بھی کھدوایا، مگر ایسی کھنڈت پڑی کہ ڈوبا مکان ہی نہ بنا۔ انھیں دنوں بڑا پوت جوان جہان، یہ چوڑی چھاتی، یہ ڈیل، گھڑیوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔۔۔ اسی برس خود ان کی آنکھ بند ہو گئی۔"

بڑی آپا چپ۔

امی سوچ میں پڑ گئیں، پھر بجھی بجھی آواز میں بولیں "خیر تائی اماں یہ تو رہنے دو۔ مکان تو پھر بھی بنا۔ اور بی بی ایسا اچھا مکان بنا ہے کہ شہر میں تو اس کا ثانی ہے نہیں۔"

"اے کیا بنا" تائی اماں نے بیزاری سے کہا "یہ کوئی بننے میں بننا ہوا۔ گھر اجڑ گیا تو ڈو با گھر بنا۔ بڑا بیٹا گیا، باپ گیا۔ چھوٹے نے کچا پکا تھپو الیا۔ اب تم کہہ دو کہ شہر میں اس کا ثانی نہیں بھلا کیا اس میں سرخاب کے پر لگے ہیں۔ پیر جی نے جو نقشہ بنوایا تھا اس کا تو یہ آدھا پونا بھی نہیں۔"

امی لاجواب ہو گئیں۔ بڑی آپا چپ بیٹھی رہیں، پھر انہیں خیال آیا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔

گارا کہ دن بھر دھوپ میں تپتا تھا گاڑھا ہوا، پھر اس پہ پپڑیاں جمنے لگیں۔ پھر سوکھ کر تڑخنے لگا۔ انجنہاریاں کہ دن بھر منڈلاتی تھیں اور پگھلا سونا سمیٹتی تھیں، ہجرت کر گئیں۔ باوا نے کنوئیں کا خیال چھوڑا اور نل کا بندوبست شروع کیا۔ تعمیر کا کام بند، نل ڈالنے کا کام شروع تھا۔ پہلے گارے کے سوکھے ڈلے بن گئے، ادھ بنی دیواریں کہ دور سے گیلی اور بھیگی دکھائی دیتیں تھیں۔ ان کی نرمی غائب ہونے لگی۔ راج جو دن بھر اینٹیں جماتے تھے اور دیواریں چنتے تھے، دیواروں کو ادھ بنا چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ادھ بنی دیواروں پر سکوت طاری تھا۔ سوکھی کوئیا کے پاس مزدور دن بھر کام کرتے، جہاں پہلے لمبی لمبی چھڑیں نصب نظر آتی تھیں اور ان میں بندھی ہوئی لمبی رسی۔ پھر وہ چھڑیں غائب ہوئیں اور پستہ قد نل نصب ہوا۔ نل چلا۔ نل کے ساتھ گارا گیلا ہوا اور خشک ادھ بنی دیواروں میں نمی کی رو پھر سے دوڑی اور انجنہاریاں کہ گارے کو سوکھا دیکھ کر ٹل گئی تھیں اب پھر کبھی نل کے پاس کی پیلی پاکیزہ کیچڑ پر منڈلاتیں اور کبھی گارے سے رس کھینچتی دکھائی دیتیں۔

نل دن بھر شور کرتا اور دن بھر دیواروں پہ کھٹ کھٹ ہوتی رہتی، اور دن بھر ضمیر کبھی تازہ تازہ بنی ہوئی دیواروں اور سوندھی خوشبو والے کمروں میں جہاں ملبہ اسی طرح پڑا تھا گھومتا، کبھی اس کھڑاگ سے بیزار ہو تھک تھکا کر بڑ کے درخت کے نیچے آجاتا جہاں

اینٹوں اور روڑیوں اور نل کے شور سے دور چھاؤں تھی اور سکون اور گندل کی چلم سے نکلتی ہوئی غنودگی آمیز گڑگڑاہٹ اور بند ہوتی ہوئی آنکھیں:

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایو کھائے
ہیرا جنم امول تھو کوڑی بدلو جائے

ہیرا اپنے پھٹے ہوئے پیروں کو دیکھتا۔ انگلیوں اور ہتھیلیوں کو دیکھتا کہ چرس کی رسی کی رگڑ سے سرخ ہو گئی تھیں، چھل گئی تھی اور کہنے لگتا "گندل، بہا اچھا ہے ایشور کی، اب کے ورشا ہو گی؟"

گندل کھانستا اور چلم پینے لگتا۔

ہیرا چپ بیٹھا رہتا اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا "اچھا ساون بھیو، ایک بار بھی آلھا نئیں پڑھی۔"

بنی اور اچھے حویلی سے آنکھ بچا کر نکلتے اور دوپہر بھر بھونڑ میں منڈلاتے رہتے اچانک کسی سمت سے نمودار ہوتے اور دور سے آواز لگاتے "ضمیر بھائی، دیکھو، ہمارے پاس بڑیا۔"

"بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا اسلام کہیو۔"

"اور میرا بھی" اچھے ٹکڑا لگاتا۔

"بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا اسلام کہیو اور اچھے کا بھی۔" اور بڑھیا بنی کی ننھی منی چٹکی سے نکل کر فضا میں تیرنے لگتی۔

وہ انھیں ڈانٹنے لگتا "کہاں پھر رہے ہو دھوپ میں ۔۔۔ ادھر آؤ۔"

دونوں کے دونوں رکتے۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے اور پھر الٹے بھاگ پڑتے "ضمیر بھائی ہم گھر جا رئے ہیں۔"

بنی اور اچھے نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور وہ اپنے کام سے لگ جاتا۔ پھر وہ بڑ

کے نیچے چار پائی پر آلیٹتا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں کہ وہ دونوں پھر آن وارد ہوتے، مگر اس مرتبہ ڈرے ہوئے، آنکھوں میں دہشت۔

''ضمیر بھائی گرگٹ۔''

''واں'' اچھے اشارے سے بتاتا ''کھنڈال کے پیڑ پہ، سرخ ہو گیا ہمیں دیکھ کے۔''

''تو گھر نہیں گئے تم؟'' وہ انھیں گھور کے دیکھتا اور دونوں کے دونوں اپنی جگہ پر جمے رہ جاتے۔

پھر وہ انھیں گھیر چیپ کے گھر لے کے چلتا۔ کبھی مینڈھ پہ، کبھی لیکھ میں، دگڑا، پھر پکی سڑک، سڑک سے گلیوں میں، ٹھٹیروں کی گلی، پھر بزریا، پھر پیاؤ کی گلی، پھر لال مندر، پھر گھر آجاتا، تپتا آنگن، سنسان دالان کہ کسی کسی گوشے میں کڑیوں کے قریب اکادکا بر بھنبھنا رہی ہوتی۔ دل اندر قدم رکھتے ہوئے ذرا ذرا دھڑکتا پھر ڈوبنے لگتا اور وہ پھر الٹے پاؤں بھونڑ کو ہو لیتا۔

(۶)

کوٹھی کی تعمیر جاری تھی، رکی، رک کر شروع ہوئی، شروع ہو کر رکی، رک رک کر جاری رہی۔ باوا کا اندازہ اک ذرا غلط ہو گیا تھا، مدت اور لاگت دونوں کے بارے میں، اگنے سے دگنا خرچا جا چکا تھا اور تعمیر تھی کہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی تھی۔ تعطیلات اس کی ختم ہو رہی تھیں۔ تعلیم کا اس کا سلسلہ جاری رہے گا کہ ختم ہوا چاہتا ہے۔ ضمیر کے دل میں شک پیدا ہو چلا تھا۔ امی کی باتیں بھی معنی خیز تھیں اور باوا کی خاموشی بھی۔ امی نے مختلف موقعوں پر مختلف لہجوں میں بات کی لیکن مرکزی نکتہ ایک ہی تھا۔ تائی اماں سے کہتیں "اجی تائی اماں، پڑھائی تو بی اے پہ ختم ہو جاوے ہے۔ موئے ایم اے کی تو بس ٹیم ٹام ہے میں تو ان سے یہ کہہ رہی ہوں کہ بس کرو۔ بی اے کر ہی لیا ہے نوکری جیسی قسمت میں ہے مل جاوے گی۔ بخت مارے ایم اے سے کیا سرخاب کا پر لگ جاوے گا۔" پھر اسے سمجھانے لگتیں "بھیا اس پڑھائی کو طاق میں رکھو اور کچھ کرو۔ باپ کی پنشن ہو گئی۔ ضعیفی کا وقت ہے۔ اسی وقت کے لیے تو اولاد مانگیں ہیں کہ پیری کا سہارا بنے۔ وہ کمائے ہم کھائیں مگر تمھاری پڑھائی ہی ختم نہیں ہوتی۔ بچے تو ہو نہیں کہ تمھیں ہر بات سمجھائی جاوے خود بھی غور کرو، حالت کو دیکھو۔ مقدمے میں اتنی رقم لگ گئی اور

حویلی ہار کے بیٹھ رہے۔ نگوڑی کوٹھی پیسہ لیے جا رہی ہے اور پوری نہیں ہو چکتی آمدنی ہر طرف سے بند ہے، خالی پنشن ہے۔ پڑھائی کا بوجھ کیسے اٹھاویں گے۔" امی کہتیں رہیں وہ سنتا رہا، باوا خاموش رہے۔ پھر بولے۔ مگر نہ مشورہ نہ دلیل نہ نصیحت، دوٹوک بات "پڑھائی بند کرو، نوکری کا بندوبست کرو۔"

باوا کی رائے تھی کہ وہ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائے۔ کالج سے سرٹیفکیٹ لے، ان کی چٹھیاں لے کر مختلف افسروں کے پاس کہ کچھ کے وہ ممنون احساس تھے اور کچھ پر ان کے احسانات تھے جائے اور نوکری کا معاملہ کرے مگر امی کو یکا یک خیال آیا کہ حویلی سے کوٹھی میں منتقل ہونا ہے، یہ کام اکیلے آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ بات باوا کی سمجھ میں آ گئی۔ روانگی اس کی دو دن کے لیے ملتوی ہوئی اور مکان کی منتقلی وقت سے پہلے شروع ہو گئی۔

رات دیر تک وہ جاگتا رہا۔ تائی اماں روز عشاء کی نماز سے فارغ ہو بیچ آنگن میں پڑے ہوئے کھرے چھپر کھٹ پہ آبیٹھتیں اور اچھے اور بنی کے پے درپے مطالبوں پر خاک بسر آوارہ وطن شہزادوں اور نامراد شہزادیوں کے قصے سنانے لگتیں۔ آج یوں ہوا کہ کہانی کسی منزل پہ نہ پہنچی تھی کہ بنی سو گئی پھر اچھے کی آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔ تائی اماں کہانی کہتیں رہیں اور جب سننے والوں نے خراٹے لینے شروع کر دیے تو پھر ان پہ بھی غنودگی طاری ہونے لگی۔ باوا کہ رات کو فراغت اور اطمینان سے تہمد اور ململ کے کرتے میں مونڈھے پہ بیٹھے گھنٹوں خاموش حقہ پیتے رہتے تھے اور اسے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کس وقت چارپائی پہ لیٹتے ہیں آج اس کے سامنے اٹھے، حقہ الگ رکھا اور چارپائی پہ لیٹ گئے۔ تحسینہ نے آہستہ سے اٹھ کر لالٹین مندی کی اور اسی آہستگی سے پھر اپنی چارپائی پر جا لیٹی۔ رات بھیگ چلی تھی۔ تارے گردمیں اٹی میلی کوڑیاں، ٹک اجل گئے تھے۔ آخر بڑی آپا بھی کہ عشاء کے وقت سے لے کر اب تک نماز کی چوکی پہ ایک پہلو بیٹھی

تسبیح کو گردش دیے جا رہی تھیں چوکی سے اٹھیں۔ لالٹین کی لو مندی ہوتے ہوتے بجھنے لگی تھی کہ انھوں نے بڑھ کر بتی تیز کی، مگر فوراً ہی وہ پھر مندی ہونے لگی۔ لالٹین اسٹول سے اٹھا کر کان کے قریب لا کر اسے ہلایا، تحسینہ کو آواز دینے لگیں "تحسینہ۔"

"جی۔"

"بی بی تیل نہیں تھا لالٹین میں؟"

"ڈالا تو تھا۔" وہ رک کر آہستہ سے بولی۔ "مگر بوتل میں تیل ہی نہیں تھا، ذرا سا تھا۔"

بڑی آپا نے لالٹین کو اسٹول پر رکھا، بڑبڑانے لگیں "لالٹین تو جا رئی ہے، اب رات بھر اندھیرے میں پڑے رہو۔"

رات بھیگ کر خنک ہوئی، رات کہ بتی کی روشنی کے داغ دھبوں سے پاک تھی۔ بے میل، بے داغ اندھیری رات۔ تائی اماں کے خراٹے۔ اب شاید بڑی آپا بھی سو گئی تھیں، اس کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو بند ہونے لگیں۔

آنکھ کھلی تو پھر وہی روز مرہ کی فضا، بڑی آپا نماز کی چوکی پہ بیٹھیں ہوئیں، وہی پر سوز رقت بھری آواز۔

مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی

اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں، اسے لگا کہ نیند کی اقلیم سے بکا کی آواز آ رہی ہے۔

شیوہ اگرچہ اپنا نہ یہ وعظ و پند ہے
پر اس کو سن رکھ اے کہ تو کچھ درد مند ہے
کیا ہے جو عرصہ تنگ ہوا کام بند ہے
دل جمع کر کہ ہمت مولا بلند ہے

یعنی کرم شعار ہے مشکل کشا علی
مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی

امی نے اسے جھنجھوڑا "ضمیر اٹھو، کام کے دن تو سویرے اٹھ جایا کرو، روز وہی بارے بجے تک سونا، ڈوبی نیند نہ ہوئی افیم ہوگئی۔" وہ لیٹے سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھ کھول کے دیکھا تو صحن کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ نیا پرانا دنیا بھر کا کاٹ کباڑ کہ کمروں، کوٹھریوں میں بند تھا، اب صحن میں اس کا اڑنگ لگا تھا۔

بڑے ابا کی بیٹھک بھی کھلی۔ سرخ اور سرمئی چلمیں کہ بعض پہ سنہری بعض پہ روپہلی باریکی جالی کھدی تھی اسی پرانے قرینے سے چنی رکھی تھیں۔ ان پہ گرد کی تہہ کچھ زیادہ دبیز ہوگئی تھی۔ پیتل کا چمکتا اگالدان، کونے میں رکھی ہوئی لام کی شکل کی چھڑی، لمبا چوڑا تخت، تخت پہ اجلی چاندنی اور قالین اور گاؤ تکیہ، تخت کے برابر کونے میں رکھا ہوا ٹھنڈا حقہ اور ڈاٹ والی چھت کے کنڈوں میں لٹکا ہوا بھاری جھالر والا پنکھا کہ ساکت اور ساکن تھا، پر لگتا تھا کہ ابا میاں ابھی آئیں گے۔ گاؤ تکیے سے کمر لگا کے بیٹھیں گے۔ اور جھالر والا پنکھا حرکت میں آئے گا اور اس کی بھاری جھالر سے نکلتی ہوئی ہوا بیٹھک کے کونے کونے میں پہنچے گی۔

"تائی اماں۔" بڑی آپا اداس لہجے میں تائی اماں سے مخاطب ہوئیں۔ "ایسا لگے ہے کہ ابا میاں ابھی اٹھ کے ذرا مسجد تک گئے ہیں۔" بڑی آپا چپ ہوگئیں، ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ پھر ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ پھر وہ آہستہ سے باہر نکل گئیں۔

زنگ لگے برتن اور دیمک چاٹے کاغذ کہ جانے کن برسوں سے انھیں ہوا اور دھوپ نہیں لگی تھی، پرانی کیڑا لگی پوشاکیں کہ چٹکی مارے سے تار تار ہونے لگتیں، بزرگوں کی نشانیاں اور یادگاریں کہ پشتوں سے صندوقوں میں بند تھیں۔ اب یہ سب کی سب دولت اندھیرے کمروں اور تہہ خانوں اور مقفل صندوقوں سے نکل کر صحن میں آ گئی تھی۔

"اے بڑی آپا تمھیں کیا ہوگیا ہے؟" امی کمروں اور کوٹھڑیوں کا جائزہ لیتے لیتے باہر آئیں، بال اور چہرہ اور لباس سب پہ گرد اٹی تھی اور پسینے سے بھیگ چلی تھی۔ بڑی آپا کو فراغت سے بیٹھا دیکھ کے چونکیں۔ "اے بڑی آپا تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ ایسے بیٹھی ہو جیسے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اپنے سامان کی خبر لو نا، کب نکلے گا کب جائے گا۔"

"بی بی میرا کیا ہے، تم اپنا سامان نکالو۔" بڑی آپا خشک سے لہجے میں بولیں۔

"اے ہے یہ کیا بات ہوئی؟" امی تنک کر بولیں۔

"بات کیا ہوتی۔" بڑی آپا نے اپنی دانست میں لہجے میں بڑی معروضیت پیدا کی تھی مگر اس سے مایوسانہ احتجاج کا رنگ صاف عیاں تھا "تم اپنا سامان نکالو، بجھواؤ۔"

"اور تمھارا سامان؟" امی نے تنک کر پوچھا۔

"میرا سامان نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟" امی کے جیسے تتئے لگ گئے ہوں۔

باوا سامان کے انبار کے پاس کھڑے چیزیں درست کرتے تھے۔ انھوں نے مڑ کے دیکھا پھر سامان کو چھوڑ آہستہ سے قریب آئے۔ امی فوراً ان کی طرف مخاطب ہوئیں "سن رئے ہو جی، بڑی آپا کہتی ہیں میرا سامان نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟...... کیا بات ہے بڑی آپا؟"

"میں نہیں جاؤں گی۔" بڑی آپا نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

امی چپ۔ باوا چپ رہے، پھر بولے "آخر کیوں؟"

"کوئی زبردستی ہے تم جاؤ، اللہ تمھیں نیا گھر مبارک کرے۔ میں تو نہ جاؤں گی۔"

"تائی اماں دیکھ رئی ہو۔" امی نے اب تائی اماں سے انصاف چاہا۔"

تائی اماں جھڑکی کے انداز میں بولیں "اے چھموں، تجھے کیا ہوگیا ہے۔ یہ بھی خوب رئی کہ نئیں جاؤں گی۔ تو بی بی نئیں جاؤں گی تو یاں اکیلی دوالوں سے سر پھوڑو گی؟"

امی نے فوراً ٹکڑا لگایا "اور تائی اماں اکیلا بھی یاں کون رہنے دے گا؟"

"اجی میرا رہنا نہ رہنا کا ہے کا ہے۔ تحسینہ پرائے گھر کی ہے۔ دنوں کی بات ہے۔ بھائی بنیاد علی آجاویں تو چار بول پڑھواؤں اور گھر سے دھکا دوں۔ بنی ہے سو تائی اماں سے ہلی موئی ہے ساتھ چلی جاوے گی۔ رہ گئی میں، سو آنے والوں سے کہوں گی کہ بھیا ایک کوٹھڑی دے دو۔"

"بڑی آپا کیسی باولپن کی باتیں کر رہی ہو۔" امی غصہ کرتے کرتے سمجھانے پہ آگئیں "ایسی بات کرو کہ سمجھ میں آوے۔ اپنا گھر ہوتے ساتے بھلا دوسروں کے سر پڑنا۔ یہ تو بھئے کو کوسنا ہوا۔"

بڑی آپا ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ امی، تائی اماں، باوا سب چپ۔ امی نے پہلو بدلا اور اس سے مخاطب ہوئیں "ضمیر بڑی آپا کا سامان نکال۔"

"نا میرا سامان نہیں نکلے گا۔" بڑی آپا نے قطعی انداز میں کہا۔

"مگر کیوں؟" باوا نے اسی قطعی انداز میں سوال کیا۔

"بس میں یاں سے نہیں جاؤں گی۔" بڑی آپا بھی آج باوا کے مقابلے میں خم ٹھونکے ہوئے تھیں۔

"آخر کیوں نہیں جاؤ گی؟ وجہ؟" باوا کا لہجہ درشت ہو گیا۔

"نہیں جاؤں گی۔" بڑی آپا نے تڑخ کر کہا، مگر فوراً ہی آواز میں دکھ پیدا ہو گیا۔ "اب تو میرا جنازہ ہی یاں سے جائے گا۔۔۔ ابا میاں کی آنکھ یہیں بند ہوئی تھی، میری بھی۔۔۔" بڑی آپا، پڑیں، پھر سکیاں لینے لگیں۔

باوا آہستہ سے سرکے اور پھر سامان کے انبار کے پاس آ کے چیزیں درست کرنے میں مشغول ہو گئے۔

"ضمیر۔"

''جی۔''

''ایک ٹھیلا تو لدگیا ہے، اسے لے کر جاؤ۔''

وہ باہر نکلا تو سچ مچ دروازے پہ ٹھیلا لدا کھڑا تھا اور بنی اور اچھے بے صبری سے ٹھیلے والے کے پاس آئے۔ تڑیائی لگاتے کہ چلو، پھر پیچھے جاتے اور اپنی پوری طاقت سے ٹھیلے کو دھکیلنے کی کوشش کرتے۔ منھ ان کے سرخ ہوئے رہے تھے۔ مگر ٹھیلا ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے کہے پہ ٹھیلے والے نے پھریری لی اور ٹانڈے بانڈے سے لگا پھندا حویلی سے کوٹھی کو روانہ ہوا۔

ٹانڈے بانڈے سے لدے ٹھیلوں کا دن بھر تانتا بندھا رہا۔ بھر بھر سامان حویلی سے لانا اور کوٹھی کے برآمدوں اور کمروں میں ابھی جن کی دیواروں کا سیمنٹ بھی نہیں سوکھا تھا انڈیلنا۔ ہر ٹھیلے کے آگے آگے نقیب، بنی اور اچھے کہ کوٹھی قریب آتی تو آگے جا کر ٹھیلے کی آمد کا پورے جوش سے اعلان کرتے اور ضمیر بیزاری سے پیشوائی کو باہر نکلتا اور سامان اتروا تا۔ بنی اور اچھے ٹھیلوں کے آگے آگے نقیب بن کر چلتے، کبھی ان کا ساتھ چھوڑتے اور کبھی کوٹھی کے زینے سے چڑھ کر اونچی چھت پہ کھڑے ہو کر منادی بنتے اور کھیتوں سے پرے سڑک پہ رینگتے ہوئے ٹھیلے کو دیکھ کے غل مچانے لگتے۔ ''ٹھیلا آرا ہے۔ ضمیر بھائی ٹھیلا آرا ہے۔'' اور جب ٹھیلا کوٹھی کی حدوں میں آجاتا تو چھت سے اتر کر باہر نکل اس کی پیشوائی کرتے، کبھی نقیب، کبھی منادی، کبھی پیشوا۔ پھر اس پورے دھندے سے جی اچٹا اور ایک بڑیا کے پیچھے کہ بلندی پہ بہتی چلی جاتی تھی ہو لیے اور دور نکل گئے۔

میزیں، کرسیاں، پلنگ، چھپر کھٹ بڑے بڑے ٹرنک، مقفل صندوق، کوئی ادھ بنی پینٹری، کوئی ٹوٹا پھوٹا گڑولنا، دیگ دیگچے، کوئی لمبا بانس، انمل، بے جوڑ پائے پیٹیاں اور نواڑ کی چکتی، بانوں کی پھاندی، ساتھ میں ایک جھلنگا، ٹین کے خالی کنستر،

چھوٹے بڑے پرانے پچکے ہوئے اور نئے چمکتے ہوئے ڈبے، طوطے کی تصویر والی پالش کی خالی ڈبیاں بظاہر بے فائدہ، غرض ایک اڑنگ تھا کہ برآمدے کی چھت سے جا لگا تھا۔ اسے خفقان ہونے لگا۔ سامان اس کے سر پر چڑھا آ رہا تھا۔ برآمدے سے باہر آیا۔ پھر کنوئیں کی طرف نکل آیا۔ کنواں رکا ہوا تھا من خشک۔ بیل ایک طرف کھڑے اونگھتے تھے اور گندل بڑ کے پیڑ کے نیچے اکیلا حقہ پی رہا تھا۔

"گندل آج کنواں نہیں چلا؟"

"نئیں میاں" گندل بولا "چرس کو کتو کتر گئی۔ چوہوے تھی، ہیرا گٹھائی کرانے گیو ہے۔"

گندل نے اٹھ کر چارپائی ڈالی "چھوٹے میاں، بیٹھ جاوو۔"

ضمیر بیٹھ گیا۔ گندل نے راکھ سے اپلا کریدا، چیٹھے سے توڑ کے چلم میں بھرا، واں سے اٹھا تو ضمیر کے قدموں میں آبیٹھا۔

"ضمیر میاں کب جاوو گے؟"

"کل۔"

گندل سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے چلم کا گھونٹ لیا پھر بولا "ضمیر میاں۔۔۔ واں کے بعد جدوں ڈپٹی بن جاوو تو گندل کو اپنے دھورے بلائے لیجو۔"

ضمیر چپ بیٹھا رہا۔ گندل بھی جواب کا منتظر نہیں تھا۔ آنکھیں بند نہیں ہوئی تھیں، ہاں ایک خواب کی کیفیت ان میں پیدا تھی۔ اس کا لہجہ اداس ہو گیا "چھوٹے میاں، اپنی دیہئ میں سکت نائے ری، ہڈی نے ماس چھوڑ دیو۔ ابا میاں کی آنکھ بند ہو گئی۔ نئیں تو میں اب پلشن بے لیتا۔۔۔ یو شریر کام جو گا نئیں ریو، کچی مٹی کا ڈر ہا ہے، او یک بوجھ پڑو تو ڈھے جاوے گا۔" وہ چپ ہو گیا اس کی نظریں آس پاس کی چیزوں سے ہٹ کر سامنے کے کھیتوں میں پہنچ گئی تھیں۔ جہاں پژمردہ ہریالی پہ دھوپ چھاؤں کا کھیل

جاری تھا۔ جلدی جلدی چلتی ہوئی دھوپ، اس کے پیچھے دوڑتا ہوا سایہ، ابر کی ایک ہلکی چادر کھیتوں میں پھیلتی چلی گئی اور دھوپ کھیتوں سے پرے سڑک پہ ننگ دھڑنگ لڑکوں کی ایک ٹولی کہ منھ پہ کالونس مل رکھی تھی اور ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے بجاتے ہوئے زور زور سے گاتے ہوئے۔

کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے

برسے گا برسائے گا — کوڑی کھیت لگائے گا

کوڑی گئی ریت میں — پانی گیا کھیت میں

''بادل آرئے ہیں لگتے تو ہیں برسنے والے۔'' اس کے لہجے میں آس اور شک کی ملی جلی کیفیت تھی۔

گندل دیر تک آسمان کو تکتا رہا، پھر شک بھرے لہجے میں بولا ''پورب سے اٹھے ہیں کیا خبر ہے برس ہی پڑیں۔'' پھر فوراً ہی اس کی نظریں بادلوں سے ہٹیں اور کوٹھی کی سب سے اوپر کی اس منڈیر پر جا ٹکیں جہاں بنی اور اچھے کھڑے تھے۔ بنی نے چٹکی فضا میں بلند کی۔ ''بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا اسلام کہیو۔'' ''اور میرا بھی۔'' اچھے نے ٹکڑا لگایا۔

''بڑیا بڑیا دونوں کا سلام اللہ میاں سے کہیو۔'' اور بنی کی چٹکی کھلی، کالا بڑیا چٹکی سے نکل فضا میں بہنے لگی، اونچی اٹھنے لگی۔

گندل بڑبڑانے لگا۔ ''یو بالک نے گھنی راڑھ مچایو ہے۔'' پھر چلایا۔ ''للا جی منڈیر سے پرے کو ہو جاؤ۔''

بنی اور اچھے منڈیر سے چھت پر کود لئے۔ اوجھل ہوئے، پر فوراً ہی پھر اچکے، ننھے ننھے دو سر منڈیر کے پیچھے سے دم کے دم میں ابھرے اور پھر اوجھل ہو گئے۔

گندل نے پھر چلم منھ سے لگا لی۔ پرے کھیتوں میں وہ تکتا رہا، پھر گڑ گڑ گڑ کی نیند بھری آواز اس کی آنکھوں پر اس کے پورے جسم پر عمل کرنے لگی۔ آنکھیں مندنے

لگیں اور سوز اور نیند میں ڈوبی وہ آواز ہولے ہولے پھر ابھرنے لگی:

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایو کھائے
ہیرا جنم امول تھو کوڑی بدلو جائے

بڑی آپا جنہیں وہ روتے ہچکیاں لیتے چھوڑ آیا تھا، تحسینہ جو کمروں سے سامان نکالتے وقت دور سے نظر آئی تھی، چپ چپ کھوئی کھوئی سی۔ وہ خیالات میں گم دیر تک بیٹھا رہا، پھر ہڑبڑا کر اٹھا، اٹھ کے کوٹھی کی طرف ہولیا، جہاں سامان کے آنے کا سلسلہ قائم تھا۔ دن جا رہا تھا اور سامان ابھی بہت آنا باقی تھا۔ ٹھیلوں کا ایک تار بندھا ہوا تھا کہ لدے پھندے رکتے رینگتے آتے اور خالی ہو کر جلدی جلدی شور کرتے واپس ہو جاتے۔ حویلی خالی ہو رہی تھی کہ شہر خالی ہو رہا تھا۔ وہ فکر میں پڑ گیا کہ شام تک سارا سامان نہ آیا تو کیا ہوگا۔ کل تو اسے ہر حال میں چلے جانا ہے۔ اسے اپنے جانے کا خیال آنے لگا۔ حویلی کہ اس کے تئیں ماضی کی اڑتی خوشبو تھی، مانند ایک خواب کے ذہن سے بسرنے لگی۔ اب سفر اس پہ سوار تھا۔

داستان

جل گرجے
گھوڑے کی ندا

عدالت علی نے حقے کی نے موڑ کے حکیم جی کی طرف کر دی۔ پھر لمبی سی جماہی لی. بولے "حکیم جی رات اب کچھ لمبی ہونے لگی ہے۔"

حکیم جی نے حقے کا گھونٹ لیا، بولے "راتیں تو اب لمبی ہوتی ہی چلی جائیں گی۔ موسم بدل رہا ہے۔"

"جاڑے آہی گئے سمجھو، حکیم جی۔"

"ہاں بس یہ سمجھو کہ اگلے چاند سے چرپائیاں اندر چلی جائیں گی۔ اب بھی فجر کی نماز کے لیے جب میں وضو کرتا ہوں تو پانی ٹھنڈا لگتا ہے۔"

غنی بولا "حکیم جی آپ سے داستان سنے ہوئے بہت دن ہو گئے۔"

صدیق اور نصیر نے بھی تائید کی "ہاں حکیم جی بہت ہی دن ہو گئے داستان سنے ہوئے۔"

حکیم جی نے ٹھنڈا سانس بھرا، بولے "یارو اب تو ہم خود داستان بن گئے۔"

سب ذرا چپ ہوئے۔ عدالت علی بولے "حکیم جی ہم کب چلے تھے۔"
"میاں دن بیت گئے۔ اب کیا یاد کرنا اس وقت کو۔ برسات جاری تھی اس وقت۔"
"اور فساد کب شروع ہوئے تھے؟" غنی نے سوال کیا۔
ہاں تو دوستو وہ فقیر میرے رو برو چوکی پر دو زانو ہو بیٹھا اور سب کو مخاطب کر کے اپنی دل خراش داستان یوں شروع کی۔

جو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں سمند خان ابن ارجمند خان ابن دماوند خان سالار اعظم بخت خان کے لشکر طوفان اثر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں کہ ہر چند کہ فرنگیوں نے اس شیر بیشہ شجاعت کے نام کو مٹانے اور کارناموں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن آفتاب پر کس نے پردہ ڈالا ہے۔ شجاعت کی اس کی دھوم از ہند تا شام و روم ہے اور بریلی سے دلی تک جس جس بستی سے اس کے لشکر کا گزر ہوا ہے مرد اس کے نام کی قسم کھاتے ہیں۔ جاڑوں کی راتوں میں چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور اس کی دلاوری کی داستانوں سے سینوں میں آگ دہکتی ہے اور خون گرم ہوتا ہے اور بوڑھی دادیاں، نانیاں بچوں کو اس کی بہادری کی کہانیاں سناتی ہیں اور کنواریاں لڑکیاں بالیاں اس کی واپسی کے گیت گاتی ہیں۔

دوستو، دلی نے ہمیں بہت خراب کیا، بریلی سے دلی تک کی راہیں گواہ ہیں کہ ہم کیونکر بریلی سے طوفان بن کر اٹھے تھے اور اندھی دھاندی دلی چلے تھے۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے جنگل کھنڈل گئے، پہاڑ مسل گئے۔ پہاڑوں، ریگزاروں کو روندتا جنگلوں، باغوں، کھیتوں کو کھوندتا لشکر طوفان اثر دلی پر امنڈا، پر دلی کی راہیں زلف گرہ گیر بن گئیں۔ مغلوں نے میرے آقائے نامدار سے دغا کی۔ روز ہم صبح کو کمر کستے تھے اور سوچتے تھے کہ آج رن پڑے گا اور روز شام کو کمریں کھول دیتے تھے۔ شکست اس شہر نامبارک کی پیشانی پہ رقم تھی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ روز تڑکے میں

مجھے خیمے کے پیچھے سے اس کمبخت فقیر کی صدا آتی تھی۔

طوطا مینا دمڑی جی

کوڑی پیسہ دمڑی جی

راجا پرجا دمڑی جی

دلاور خان تو اس آواز کو سن کر دیوانہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ کئی بار تلوار سونت کر خیمے سے باہر نکل آیا کہ اس فقیر کا سر قلم کر دے مگر وہ فقیر کبھی نظر نہ آیا۔

مگر اس صبح کو عجیب بات ہوئی کہ اس فقیر کی آواز کان میں نہیں آئی۔ شہر آج کچھ خاموش تھا۔ ہم ہتھیاروں سے سج رہے تھے کہ اتنے میں بخت خاں کی آواز نے ہمیں سب کو چونکا دیا۔

"دلاور خاں۔"

دلاور خاں مودب آگے بڑھا، بخت خاں نے اسے اپنی انگوٹھی دکھائی، دلاور خاں سہم کر چپ ہو گیا۔

عزیزو باتمیزو، جاننا چاہیے کہ بخت خاں ایک انگوٹھی پہنتا تھا کہ اس میں فیروزے کا ایک قیمتی نگ جڑا ہوا تھا اور اس کی بدولت اس نے بہت سے معرکے جیتے تھے۔

بخت خاں کا معمول تھا کہ روز جب اٹھتا تو پہلے اس نگ کو دیکھتا پھر ہتھیار آراستہ کرتا آج جب اس نے اٹھ کر انگوٹھی پر نظر ڈالی تو نگ چٹخا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر مین خیمے پر دستک ہوئی، چوبدار ہراساں پریشاں حاضر ہوا۔ عرض کی "حضور خبر بد آئی ہے کہ شہنشاہ قلعہ سے نکل گئے۔"

دوستو مغلوں نے میرے آقائے نامدار سے دغا کی۔ وہ وقت مجھے خوب یاد ہے گویا آج کی بات ہے کہ بخت خاں مقبرہ ہمایوں میں شہنشاہ کے حضور میں تھا اور ہم باہر صفیں باندھے تلواریں نیام سے کھینچے کھڑے تھے کہ آج رن پڑے گا، دلوں کے ارمان نکلیں

گے، خاکی خاک میں لوٹیں گے۔ لشکر مانند چولہا چڑھے کڑھاؤ کے تاؤ کھاتا تھا۔ ادھر بخت خاں غیض و غضب میں بھرا ہوا، چہرہ تمتماتا تھا، منہ سے کف نکلتا تھا اور پیروں کو یوں پٹختا ہوا چل رہا تھا کہ ہم دہل گئے کہ اب دلی کی زمین پھٹی اور اب مقبرہ ہمایوں بیٹھا مگر دلی کو ابھی اور دن دیکھنے تھے اور مقبرہ ہمایوں کو کچھ اور نظارہ کرنا تھا کہ بخت خاں نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا پھر ہم سے مخاطب ہوا "رفقائے نامدار، سپاہیان وفا شعار ہم سے دغا ہوئی، شجاعت و حمیت تیمور کے گھر سے رخصت ہو گئی، غیرت نے اس شہر سے منہ موڑ لیا اور پاس ناموس مٹ گیا۔ اب شہر خراب ہوا۔ اس شہر سے نکل چلو کہ اس نے ہمیں ناکامی کا منہ دکھایا کہ اس نے بخت خاں کو خوار کیا، بخت خاں کی فاتحانہ آن کو بٹہ لگایا۔ شاہجہانی قلعہ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ جہاں آباد اب خرابہ ہوا چاہتا ہے، شاہجہان کی زمین ہم پر تنگ ہو گئی مگر اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ آؤ میدانوں میں نکل چلیں اور پہاڑوں کی راہ لیں کہ بہادر کھلے میدانوں میں لڑتے ہیں اور پہاڑوں پر مورچے جماتے ہیں۔"

عزیز و باتمیز و، تاب ضبط ہو تو یہ فسانہ عبرت فزا سنو کہ دونوں وقت ملتے تھے اور ہم دلی سے نکلتے تھے، آفتاب دن بھر کی مسافت سے تھک کر دجلہ مغرب میں غرق ہو رہا تھا اور جمنا کے پانی پر سایہ پھیل چکا تھا۔ سایہ شاہجہانی قلعہ کی فصیلوں اور برجیوں پر بھی پھیل چکا تھا۔ سایہ شہر کی فصیل پر بھی پھیل چکا تھا۔ شہر کی فصیل اور شاہجہانی قلعہ کے برجوں سے دور قطب مینار کی بلندی پر بس ہلکی ہلکی دھوپ مانند ایک سرکتے سائے کے باقی تھی اور کوئی دم میں معدوم ہوا چاہتی تھی۔ عزیز و باتمیز و شہر کی فصیل پر سایہ پھیل چکا تھا۔ شہر کی فصیل صورت تصویر خاموش تھی برجیوں پہ نصب توپیں کہ کل تک گرابیں مار رہی تھیں اور صف اعدا پر آگ اگل رہی تھیں، خاموش تھیں، دور سے کسی اکیلی توپ کی آواز آ رہی تھی۔ شاید لاہوری دروازے کی توپ ابھی تک چل رہی تھی۔

ہم دلی سے نکلے تھے کہ رات نے ہمیں آلیا اور راہیں تاریک ہو گئیں۔ عجب اندھیرا تھا کہ رستہ کیا معنی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا مگر بخت خانی لشکر کا سیلاب سارے بند توڑ چکا تھا اور جو قدم اٹھ گئے تھے انہیں کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ مشعل چیوں کو حکم ہوا کہ آگے آئیں اور مشالیں جلائیں، تب مشالیں روشن ہوئیں۔ اندھیرا جنگل اور دھڑ دھڑ کرتی مشالیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے نکلتی ہوئی چنگاریاں اور اوپر قافلہ نجوم شب کے درمیان جلاد فلک کہ مثل انگارے کے دہکتا تھا اور ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا۔ یوں اندھیرے میں دراڑیں ڈالتا اور جنگلوں کے سینے کو شق کرتا بخت خانی لشکر منزلوں پہ منزلیں طے کرتا ہوا رات کے پردے میں کہیں سے کہیں پہنچا تھا۔ جانے کیا وقت تھا مگر رات بہت گزر چکی تھی کہ بخت خاں نے گھوڑے کی باگ روکی اور سوال کیا ''عزیزو ہم کس مقام پر ہیں'' ہم سب نے اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور دم بخود کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگے کہ ہم میں سے کسی کو پتہ نہ تھا کہ ہم کس مقام پر ہیں۔ سیدھی راہ چلتے ہیں یا راہ بھولے ہیں۔ تب بخت خاں نے فرمایا ''غازیو جانبازو، یوں بے سوچے سمجھے اندھیرے میں بڑھے چلے جانا قرین مصلحت نہیں۔ جان بوجھ کر اپنے تئیں خطرے میں ڈالنا کوئی حکمت نہیں۔ چاہیے کہ منزل کرو اور دو گھڑی آرام کرلو کہ سولیں اور سوچ لیں کہ ہم کہاں ہیں، کس طرف جاتے ہیں اور کس طرف جانا ہے۔ پردۂ شب کو غنیمت جانو کہ غنیم کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ صبح ہو گی تو قیامت آئے گی اور ہمارے سفر کی خبر دشمنوں تک جائے گی۔''

یہ حکم سن کر ہم گھوڑے سے اترے اور اس دشت پرخطر میں حضر کیا کہ ارد گرد دور تک اونچے کالے درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔ ہم کیا بے سروسامانی میں دلی سے چلے تھے کہ سامان سفر و حضر بھی پورا ہمراہ نہیں تھا۔ جب گھوڑے کو درخت کے تنے سے باندھ، زین سر کے نیچے رکھ زمین کے فرش پر آسمان کی چھت کے نیچے دراز ہوا تو

سمند خاں نے کہ معرکہ کارزار میں کیسا ہی رن پڑا کبھی ہراساں نہ ہوا اس وقت دیو قامت مخلوقات سیہ پوش اشجار بے شمار کے نرغے میں اپنے تئیں بہت حقیر جانا۔ اشجار بے شمار کے لشکر سے پرے دشت فلک میں ان گنت مشعل برداروں کا جلوس جلاد فلک کے ساتھ رواں تھا۔ دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹا اور پہنائے فلک میں ایک روشن لکیر یوں دوڑتی چلی گئی جیسے میدان جنگ میں کوئی گراں ڈیل سپاہی گرا ہے اور اس کی خبر صف بہ صف کراں تا کراں پھیلتی چلی جاتی ہے۔ ہم نے کالے جنگل میں پڑاؤ کیا تھا اور عرصہ فلک پر فوج نجوم کا کوچ جاری تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ فوج نجوم بس گزرا چاہتی ہے اور آسمان کا میدان خالی ہوا چاہتا ہے۔ جانے کیوں اس خیال سے میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تھیں کہ نیند کے لشکر نے یلغار کی اور دیو قامت اشجار بے شمار اور آسمان کے ان گنت مشعل بردار سب کہیں گم ہوتے چلے گئے۔

ستارۂ سحری کی نمود کے ساتھ ارادۂ کوچ کا درود ہوا۔ جب میری آنکھ کھلی تو بخت خاں آراستہ ہو چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے سے تشویش عیاں تھی، دلاور خان نے بڑھ کر عرض کی کہ آقائے نامدار آج حضور کو تشویش کیسی ہے۔ جواب دیا "دلاور خان رات ہم نے عجیب خواب دیکھا کہ اس وقت سے نیند خواب ہوئی اور رات آنکھوں میں کٹی۔" اس پر ہم سب کو فکر فزوں ہوئی اور سوال کیا کہ "اے خداوند نعمت وہ خواب کیا تھا جس نے ہمارے آقا کو بے آرام کیا اور ہمارے لیے فکر کا سامان کیا۔"

تب بخت خاں یوں گویا ہوا "اے یاران باوفا اور عزیزان باصفا کیفیت اس خواب کی یہ ہے کہ دیکھا کہ ایک لق و دق صحرا ہے اور بخت خاں اکیلا ہے۔ لشکری بچھڑ چکے ہیں۔ سپاہی چھٹ چکے ہیں۔ پھر دیکھا ایک مینار ہے کہ انگاروں کا ایک انبار ہے کرسی اس کی چکی کے پاٹ کی صورت بنی ہے اور گرم رفتاری سے گھومتی ہے کہ مینار پر

نگاہ نہیں ٹکتی۔ بس ایک شعلہ سینہ گیتی سے تا چرخ چنبری بلند ہوتا گردش کرتا نظر آتا ہے۔ میں ڈرا کہ یا معبود یہ کیا سحر کا کارخانہ ہے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ یوں ڈرنا خلاف شیوۂ مردانہ ہے۔ نعرۂ حیدری یا علی بلند کیا اور گھوڑے کو ایڑ دے کر دم کے دم میں مینار کے پاس پہنچا۔ عجب ہوا کہ چکی کا پاٹ گھومتے گھومتے رک گیا۔ اب جو دیکھا تو اور ہی منظر کھلا کہ وسیع و عریض قطر کی ایک چکی ہے، چکی پر ایک بلند و بالا مینار سنگ سرخ کا ہے۔ مینار پر ایک برج ہے، برج میں ایک بڑا سا نقارہ رکھا ہے۔ نقارے کے برابر ایک چھڑی دھری ہے اے یاران باوفا اور اے عزیزان باصفا اس وقت مجھے طرفہ خیال آیا کہ مینار پر چڑھو اور اس نقارے کو بجا کر قدرت خدا کا تماشا دیکھو۔ اس بلندی سے نقارے کی آواز فاصلوں پر غالب اور ملک پر محیط ہوگی جس بستی، جس جنگل، میں بخت خاں کا سپاہی آوارہ بے خانماں پھرتا ہے وہ اس آواز کو سنے گا اور رخ اس سمت کا کرے گا۔ میرے دل میں ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ مینار کے اندر سے صدا آئی۔ اے! بد بخت اپنی کڑیل جوانی پہ رحم کر، اس مینار سراسر نار سے حذر کر، یہ زندگی اور موت کا ہولناک کھیل ہے۔ اس کھیل میں اندیشہ جاں ہے، جی کا زیاں ہے۔'' اس صدا کو میں نے للکار جانا اور پیچھے ہٹنا اپنی وضع سپاہیانہ کے خلاف سمجھا، سو چا ہر چہ باد آید بر سر فرزند آدم اور اندھا دھند مینار میں داخل ہوگیا۔ وہ مینار باہر سے مثل انگارہ روشن لیکن اندر سے تیرہ و تار تھا، گرم مانند کرۂ نار تھا، زینہ پیچدار تھا۔ بیچ میں پیچ یہ پڑا کہ مینار کے اندر قدم رکھتے ہی چکی پھر گھومنے لگی اور مینارہ پیچ کھانے لگا۔ اے عزیزو اس وقت مجھ پر اپنی ناطاقتی کھلی اور عجب رقت طاری ہوئی کہ بخت خاں تو اپنے تئیں بہت بہادر جانتا تھا اور شجاعان بے مثال اور حریفان رستم و زال سے نبرد آزما ہوتا تھا۔ زمانے کی گردش نے کیا دن دکھایا ہے کہ وقت کی چکی میں بے وجہ پسے جاتے ہیں اور سپاہی ہو کر بے لڑے مارے جاتے ہیں۔ ناگہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ٹاپوں کی آواز سے سارا دشت گونج گیا۔ ایک سوار

سبز پوش قبضے میں شمشیر آبدار، چہرے پر نقاب داخل ہوا کہ اس کے اندر قدم رکھتے ہی مینار گھومتا گھومتا تھم گیا اور زینے کا راستہ اجل گیا اور ہماری آنکھ کھل گئی۔

پھر بخت خاں نے سکوت اختیار کر لیا اور سپاہیوں کو وسوسوں اور وہموں نے گھیر لیا۔ اس وقت مجھے معاً اپنے جد امجد کی بات یاد آئی اور مودب عرض کیا کہ "آقائے نامدار گستاخی معاف ہو، یہ خواب نہیں تھا، بشارت تھی۔"

بخت خاں نے نہایت وقار سے سر بلند کیا اور مجھ پر نظر فرمائی۔ "وہ کیونکر۔"

حکایت شیر شاہی مینار کی

میں مؤدب ہو بیٹھا اور یوں عرض کیا کہ "اے آقائے ولی نعمت۔ میں سمند خاں ابن ارجمند خاں ابن دماوند خاں خانوادہ اس خاندان عالی شان و بلند نشان کا ہوں جس کا سلسلہ نسب شیر شاہ سوری سے ملتا ہے۔ میں نے اپنے جد امجد سے اور میرے جد امجد نے اپنے جد امجد سے یوں سنا ہے کہ ہمارے جد اعلیٰ حضرت شیر شاہ سوری نے کرۂ ارض کے قلب میں ایک کیل بصورت مینار بلند پیوست کی تھی۔ یہ زمین پر ان کی آخری فتح تھی۔ اے آقائے ولی نعمت اور اے یارانِ طریقت، کرۂ ارض فاتح گیتی حضرت شیر شاہ سوری کے تئیں گیند کا گولا تھا جس طرح چاہتے تھے اچھالتے تھے اور لپکتے تھے۔ ارض ہند کی انھوں نے ایسی طنابیں کھینچیں اور سڑکوں کی زنجیریں اس طرح پہنائیں کہ آج تک کلکتہ سے پشاور تک کا فاصلہ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، جانا جاتا ہے کہ ایک بار شیر شاہی لشکر قلب گیتی کی راہ سے گذرا تھا۔ سمندروں کی گرد میں فاصلے گرد ہو رہے تھے اور ٹاپوں کی دھمک گاؤ ارض تک پہنچ رہی تھی۔ ناگاہ ایک دشت پُر ہول نظر آیا کہ ریت مثل بالو کے جلتی بلتی تھی اور سطح زمین کلیجے کی صورت دھڑکتی تھی۔ گھوڑوں کے قدم رک گئے۔ سوار ٹھٹھک گئے۔ حضرت شیر شاہ نے لاکھ گھوڑے کو ایڑ دی مگر وہ رہوار جو زمین و

زمان کی گردشوں کو اپنی ٹاپوں کی گرد جانتا تھا ٹس سے مس نہ ہوا۔ وزرائے باتدبیر نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا کہ "جہاں پناہ اس پرخطر راہ سے گذرئیے اور دوسری راہ سے چلئے۔" حضرت شیر شاہ کو جلال آ گیا۔ فرمایا کہ "زمین سے ہزیمت اٹھانا مردان فلک وقار کے شایان نہیں اور راہ کی دشواری سے ارض شکاروں کا ڈر جانا طریق ارض شکاری نہیں۔ ہمارے سمند سمندر اثر کا یوں ٹھٹھکنا ہماری توقع کے خلاف اور اس کی روش سے دور ہے۔ مقرر اس میں کوئی راز مستور ہے۔ روایت کشور کشائی کا تقاضا ہے کہ اس گرہ کو کھولا جائے اور اس زمین کی حقیقت کو سمجھا جائے۔

پس شیر شاہی لشکر نے اس دشت دہشت اثر میں پڑاؤ کیا اور دن رات تدبیریں اس زمین کے بھید کو کھولنے کی ہوتی رہیں۔ دو دن تک لشکری تگ و دو کرتے رہے مگر سراغ اس راز کا نہ ملا۔ تیسرے دن فلک جناب نے بنفس نفیس اس گرہ کو کشود کرنے کی ٹھانی۔ رہوار ارض شکار پہ سوار ہوئے اور عزم بالجزم کیا کہ جو ہو سو ہو آج ہم اس دشت کو ضرور عبور کریں گے رہوار کو ایڑ دیا چاہتے تھے کہ ایک مرد بزرگ نامعلوم سمت سے نمودار ہوا اور آگے بڑھ کر لگام تھام لی اور بولا "اے شیر شاہ اس ارادے سے باز آ، اپنی رعیت پہ رحم کھا، اس دشت بلا میں جس بادشاہ نے قدم رکھا، سلطنت کو اس کی زوال ہوا، رعایا کا ابتر حال ہوا، برباد ملک و مال ہوا۔"

دریافت فرمایا "اس بلا کا کیا باعث ہے؟"

اس مرد دانا نے جواب دیا "اے کشور کشا گیتی ستاں، یہ مقام زمین کا قلب ہے گاؤ زمین کے دونوں سینگوں کے عین درمیان واقع ہے قلب گیتی مقام کرب و بلا ہے کہ مردان خطر پسند کو للکارتا اور پچھاڑتا ہے۔ جو دلاور قلب گیتی کو مٹھی میں لے گا اور قابو پائے گا چار دانگ میں ڈنکا اس کا بجے گا اور ہمالہ سے لے کر وندھیا چل اور وندھیا چل سے راس کماری تک سلطنت اس کی پھیلے گی۔

تب میرے جد امجد کو جلال آیا کہ جب کشور کشائی کے پرخطر میدان میں قدم رکھا ہے تو جھجھکنا کیوں اور آدھی راہ چل کر پلٹنا کس واسطے۔ بڑھ کر نام بوتراب کا لیا اور نیزہ پھینک کر ایسا مارا کہ بیچوں بیچ اس دشت کے گڑ گیا۔ اثر اس کا عجب ہوا کہ دشت ہلتے ہلتے رک گیا۔ تب جد امجد نے حکم دیا کہ اس فتح کو پائے کمال تک پہنچائیے اور ایک مینار بلند تعمیر کیجیے کہ برج میں اس کے نقارہ رکھا جائے۔ نقارے پہ چوب پڑے اور شیر شاہ کی فتح کا عالم میں شور پڑے۔

تب دور دور سے ہوشیار معمار بلائے گئے اور نقشے تعمیر کے جمائے گئے۔ ایک مینار فلک آثار تعمیر ہوا کہ سات اس کی منزلیں اور سات اس کے زینے تھے۔ ساتویں منزل میں ایک برج تھا اس میں نقارہ اور چوب رکھی گئی کہ نیک ساعت شبھ گھڑی دیکھ کر شیر شاہ کے نام کا نقارہ بجے۔ ادھر یہ انتظام تھا اُدھر کچھ اور ہوا چاہتا تھا۔ ناگہاں جانب مغرب سے غبار اٹھا اور ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی۔ جب ذرا گرد چھٹی تو دیکھا کہ راجپوتوں کی فوج موج موج چلی آتی ہے اور طوفان بلا بن کر ٹوٹا چاہتی ہے۔ شیر شاہی لشکر دم کے دم میں آراستہ ہو اس طوفان بلا سے قیامت بن کر ٹکرایا اور دشمن کو دور تک بھگایا مگر ستم ہوا کہ دشمن کا تعاقب کرتے کرتے لشکر اتنی دور نکل گیا کہ مینار فلک آثار نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب دشمن سنبھلا، صفیں درست کیں اور بلا کا رن پڑا۔ مگر مینار نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور شیر شاہ کی زندگی کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے جد امجد سے اور میرے جد امجد نے اپنے جد امجد سے یوں سنا ہے کہ ہمارے جد اعلیٰ حضرت شیر شاہ نے مرتے دم آل و انصار کو وصیت فرمائی تھی کہ جب شیر شاہی مینار کے نقارے کی آواز کان میں پڑے جاننا کہ شیر شاہ کی مہم کو منزل تک پہنچانے والا پیدا ہوا اور اس کی نصرت کو پہنچنا۔ اے آقائے ولی نعمت اور اے یارانِ طریقت دیکھنا خواب میں اس مینار کا ظاہر کرتا ہے کہ نقارۂ شیر شاہی پر چوب پڑنے کا

وقت آپہنچا۔"

بخت خاں نے تعبیر اپنی رویا کی سن لی تو یوں گویا ہوا کہ "اے رفیق، وہ مینار کس سمت میں ہے اور کتنے دنوں کی راہ ہے۔"

میں نے مودبانہ عرض کیا کہ "آقائے ولی نعمت، میں نے اپنے جد امجد سے اور میرے جد امجد نے اپنے جد امجد سے یوں سنا ہے کہ شمال مغرب میں برس دن کی راہ ایک گھنی بنی ہے، گھنی بنی سے پرے کالی ندی ہے، کالی ندی کے اس پار وہ دشت پر خار ہے۔ اس میں وہ مینار فلک آثار ہے۔"

اس عاجز کا یہ کلام سن کر بخت خاں یوں گویا ہوا کہ اے رفقائے نامدار اور اے غازیان وفا شعار، شیر شاہ نے زمین کی طنابیں خوب کھینچیں اور بے فرسنگ فاصلوں کو خوب جکڑا مگر وقت کے دریا پر بند نہ باندھا۔ وقت بغیر کرہ ارض مٹی کا ڈھیلا ہے۔ وقت نے شیر شاہ سے دغا کی اور زمین کو اس کے چنگل سے چھڑا لیا مگر اب قلب گیتی پھر مانند کلیجے کے دھڑکتا ہے اور شیر شاہی مینار بسان آسیائے دہر گردش کرتا ہے۔ جرنیلی سڑک فوج فرنگ کے قدموں تلے کراہتی ہے۔ ادھر ڈلہوزی کی بنائی ہوئی راہ پر دھواں گاڑی دوڑتی ہے۔ شیر شاہی سرائیں ویران ہوگئیں۔ پیاؤ سکھ گئے، ٹھنڈے میٹھے کنوئیں میں کچھ کھاری ہوئے کچھ خاک سے اَٹے کچھ لاشوں سے پٹے اور گھنے پیڑوں سے چھاؤں رخصت ہوگئی۔ جرنیلی سڑک کے پیڑ چھاؤں سے محروم، مسافر نوازی سے مجبور برقی تاروں میں جکڑے ہوئے سر برہنہ شہزادیوں کو ناز اندامو ں کو گل بدنوں کو حیراں حیراں پھرتے، رنج سفر اٹھاتے، ہرج مرج کھینچتے ششدر کھڑے دیکھتے ہیں اور اپنے لگانے والے کے اقبال کا نوحہ کرتے ہیں۔ رفیقو، وقت کی زال بیسوا نے شیر شاہ سے دغا کی۔ شیر شاہی سڑک کے یہ قطار قطار قیدی شیر شاہ کے جانشینوں کو پکارتے ہیں۔ غازیو اس پکار کو سنو، ان برقی تاروں کو کاٹو اور اشجار سایہ دار کو ان کا سایہ اور ہریالی اور

ہے۔ عزیزو پانی کی آواز عجب ہوتی ہے۔ جن غازیوں اور سورماؤں کے سیلاب پر توپ وتفنگ سے آراستہ فرنگی، بند نہ باندھ سکے تھے انھیں پانی کی آواز نے دم بخود کر دیا تھا۔ دفعتاً ایک گھوڑا دہشت بھری آواز میں ہنہنایا اور صف سے ٹوٹ کر معہ سوار سرپٹ بھاگا اور درختوں میں مڑ گیا۔ سب ابھی ششدر تھے کہ یہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا کہ اتنے میں میں نے اپنے برابر دلاور خاں کو دیکھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر مثل بید کے کانپتا ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ندی کی طرف تکتا ہے۔ میں نے آنکھ جھپکی تھی کہ دلاور خاں نے دہشت میں نعرہ مارا اور گھوڑے سے کود کر آن کی آن میں ندی میں پھلانگ گیا۔

دلاور خاں کا ندی میں چھلانگ لگانا قیامت ہوا۔ ندی کی دھار زور گرجی جانو بادل گرجتے ہیں۔ عزیزو بادل زمین میں بھی گرجتے ہیں اور بجلی پانی کی تہہ میں بھی کڑکتی ہے۔ اس ساعت ندی میں بادل بھی گرجے اور بجلی بھی کڑکی کہ جانو زمین کی تہہ پھٹ گئی اور اندر دبا ہوا لاوا پھوٹ پڑا۔ ایک آندھی چلی کہ زمین و زمان تیرہ و تار ہوئے اور پھر خون کی بارش ہونے لگی۔ کالی ندی پہ خون برسا اور آسمان سرخ بوٹی کی مثل ہو گیا اور جنگل لال انگاروں کی طرح دہکنے لگا۔ گھوڑے ہنہنائے، صفیں تتر بتر ہو گئیں۔ سپاہیوں کے ہاتھوں سے باگیں چھوٹ گئیں اور جس گھوڑے کا جدھر منھ اٹھ گیا دہشت میں ہنہناتا گاہ معہ سوار کے گاہ سوار کو پٹخ سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔

اس رستا خیز میں میرا گھوڑا بھی بگڑ گیا اور ڈراؤنی آواز میں ہنہناتا بگٹٹ بھاگ چھٹا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں جاتا ہوں۔ باگ پہ ہاتھ تھا نہ پاؤں رکاب میں تھے۔ جب تڑکا ہوا تو اپنے تئیں اکیلا ایک سنسان جگہ میں پایا۔ نہ وہ کالی ندی تھی نہ گھنی بنی تھی۔ نہ لشکری نہ میر لشکر، آدمی کا دور دور پتہ نہ تھا۔ جنگل بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور گھوڑے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ جس راہ چلتا ہے چلا چلے۔

داستان شہر ویران کی

چلتے چلتے راہ میں ایک بستی نظر آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور بستی میں داخل ہوا مگر وہ بستی عجب تھی۔ خالی ڈھنڈار پڑی تھی۔ نہ مکین نہ دکاندار، گلی کوچے ہو حق کرتے تھے۔ ہر مکان ویران، ہر مکان پہ گولیوں کے نشان، حویلیاں ڈھئی ہوئیں، دکانیں گری ہوئیں، غارت گری کے نشان مکان مکان، خونریزی کے آثار گلی گلی، چوکوں اور بازاروں میں جابجا لاشیں پڑی تھیں۔ دکانوں کے دروازے کھلے تھے، مال بکھرا پڑا تھا، مکانوں کے دروازے شکستہ تھے، پہریدار غائب تھے۔ میں تصویر حیرت بنا کچھ حراساں کچھ پریشاں اس شہر مرگ میں چلا جاتا تھا کہ سامنے ایک عالی شان حویلی نظر آئی توپوں کے گولوں کے نشان جابجا تھے۔ بہت سے کنگرے گر گئے تھے اور دریچے اڑ گئے تھے کہ یوں اس کی بلند دیواروں میں بھمباتے کھل گئے تھے۔ پھاٹک چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ ڈیوڑھی خالی تھی۔ بس ایک ہاتھی زنجیر تڑائے آوارہ آوارہ احاطے میں پھر رہا تھا اور فوارے کے ارد گرد کاہی جمے پانی کو سونڈ سے گنجول رہا تھا۔ اس عبرت فزا منظر کو دیکھ کر میرے دل میں عجب خیال پیدا کہ اندر چل کر دیکھو شاید اس افسانے کے آغاز اور انجام کا کچھ سراغ ملے۔

میں نے اندر قدم رکھا تو جانوروں میں ایک شور پڑا۔ بطخوں کے جالی دار دڑبوں میں ایک قیامت مچی تھی اور ٹاپوں کے اندر مرغیاں چلاتی تھیں۔ ایک بڑی سی صندلی بلی ایک کمرے کے اندر سے نکلی اور مجھے حسرت بھری طلب آمیز نگاہوں سے دیکھ میاں میاؤں کرنے لگی۔ میں نے دڑبے کھولے اور ٹاپے اٹھائے تو بطخیں اور مرغیاں شور مچاتی بے تابانہ فوارے کے ارد گرد ٹھہرے ہوئے کاہی بھرے پانی کی طرف لپکیں اور ایک دم سے ان گنت چونچیں اور پنجے کاہی بھرے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیوست ہو گئے۔

پھر میں نے اندر قدم رکھا۔ ایوان ایک نظر آیا وسیع و عریض، سقف بلند نصف

دائرے کی صورت، اونچے اونچے ستون، بڑی بڑی دیواریں کہ اب سب بُجی کھسٹی تھیں۔ قد آدم آئینے شکستہ تھے، جھاڑ فانوس چکنا چور ہوئے تھے، شمعدان، گلدان، اگردان، گلاب پاش، خوبصورت کشتیاں نازک صراحیاں، جھمکتے کٹورے اجلے پیالے، سنہری روپہلی جھالروں والے بھاری پردے، رنگ رنگ لاثانی تصویریں، غرض صنعت انسانی کا ایک کارخانہ تھا کہ بکھرا پڑا تھا اور اپنی بے قیمتی و ناقدری کا نوحہ کرتا تھا۔

اس ایوان وسیع سے نکلا تو ایک صحن کشادہ میں آیا۔ وہ کشادہ صحن خالی پڑا تھا اور فوارہ بند تھا۔ سنگ مرمر کا حوض سوکھا پڑا تھا۔ ناگاہ ایک طوطے کے پھڑ پھڑانے اور چلانے کی آواز کان میں آئی۔ نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے ایک لمبا چوڑا دالان ہے، دالان میں ایک کندہ پڑا ہے۔ کندے میں ایک نفیس پنجرہ لٹکا ہے پنجرے میں ایک طوطا، لال پچھپا چونچ، گلے میں کنٹھی، بازو پر سرخ پیسہ۔ پھڑ پھڑاتا ہے اور چونچ کھولے ہانپتا ہے۔ میں نے بڑھ کر پنجرہ اتارا۔ بہت ڈھونڈنے پر ایک روڑے گھڑے میں تھوڑا سا پانی نظر آیا۔ تب طوطا چلایا۔ ''حق اللہ پاک ذات اللہ، بی بی کنوئیں میں'' تب مجھ پر وہ راز ہویدا ہوا۔ اس دالان کے عقب میں اندھا کنواں تھا۔ وہاں سے یہ آواز آتی تھی۔ میں نے اپنا صافا کھولا اور کنوئیں میں لٹکایا۔ کسی نے اندھیرے میں وہ صافا پکڑا اور میں نے آہستہ آہستہ اسے کھینچنا شروع کیا۔ جب وہ شے کنارے پر آئی تو عجب منظر نظر آیا۔ گویا اندھیرے سے روشنی کی کونپل پھوٹی ہے یا سیپی کی ظلمت سے موتی نمودار ہوا ہے۔ بدن روشن، رخساروں میں دیئے جلتے ہوئے، لویں لو دیتی ہوئیں۔ مگر روشنی غبار میں تھی، ملبوس لیر لیر، مٹی میں اٹا ہوا، بال الجھے ہوئے، ہونٹوں پر پپڑیاں، لب بند، غشی کی کیفیت۔ میں نے جلدی سے اس نور کے پتلے کو گود میں اٹھایا اور چھپر کٹ پر ڈالا، نبض دیکھی، رخسار اور پیشانی کو چھو کر دیکھا، منہ پر پانی چھڑکا، ہونٹ کھول کر ایک چلو پانی ڈالا، منہ پہ پانی پڑا تو اس نے جھرجھری لی، آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرا دم میں دم آیا۔

حمام سے جب نہا دھو کپڑے بدل بال جھٹکتی نکلی میں سمجھا برسات آ گئی، ساون کی گھٹا چھا گئی، وہ بدن کیا تھا ایک بغیچہ تھا، گات ہری بھری، کمر بھری بھری، سینہ کنول کے دو پھول پھولوں میں دو گمٹیاں، بانہیں لچکتی ڈالیاں، رخسار شاداب، ہونٹوں میں پھول کھلے ہوئے، آنکھوں میں جوہی پھولی ہوئی۔ میرے پوروؤں میں اور انگلیوں میں ہتھیلیوں میں، پورے بدن میں پھول کھل اٹھے اور اس تصور سے کہ میں نے ابھی ابھی اس جسم کو چھوا ہے۔ دماغ عرش میں جھولنے لگا۔ وہ بصد تمکنت آئی اور چھپر کھٹ پر بیٹھ گئی۔

میں نے آخر ہمت کر مزاج پرسی کی۔ بولی "اچھے ہوں، بدن قدرے دکھتا ہے، جی پھینکتا ہے" اور آہ سرد بھر چپ ہو گئی۔

پھر بولی "اے عزیز جوان، تجھے جو احسان کرنا تھا کر لیا۔ اب اپنی کڑیل جوانی پہ رحم کر اور جلد اس نحوست بستی سے نکل جا۔ جانے کس گھڑی کس آن فرنگی فوج اس سمت سے پھر گذرے اور باقی رہی سہی جانوں کو ملیا میٹ کر دے۔"

میں آبدیدہ ہو بولا "میں اپنے رفیقوں سے بچھڑ کر خراب پھرتا ہوں۔ اپنی زندگی سے تنگ آیا ہوں۔ اپنے لشکر کی جستجو میں آوارہ پھرنا تھا کہ قدرت ادھر لے آئی۔ میں نے اس صحبت یک نفس کو غنیمت جانا تمھیں یہ صحبت ایسی ہی ناگوار ہے تو سپاہی پہلے ہی خوار اور جی جان سے بیزار۔۔۔۔"

اس بات پر وہ خوش بخت گھبرائی اور بات کاٹ کر بولی: "اے ہے اچھے سپاہی ہو، ذرا سی بات پہ ٹسوے بگھارنے بیٹھ گئے۔ مجھ کال کھاتی نے تو تمھارے بھلے کو کہا تھا۔ اپنی جان کے ایسے ہی بیری ہوئے ہو اور جان بوجھ کر ہلاکت مول لیتے ہو تو شوق سے رہو۔"

ابھی وہ یہ کہتی تھی کہ باہر احاطے میں میرا گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ میں چونکا کہ کوئی

آفت آئی۔ جلدی سے اس گلشن خوبی کی کلائی پکڑی اور کھینچتا ہوا چلا کہ "دشمن آ گیا۔ یاں سے چل نکلو۔" ہمیں یوں جاتے دیکھ کر طوطا چلانے لگا۔ اس کی آواز سن کر وہ مڑی اور بولی۔

"اپنے مٹھو کو چھوڑ کر کسی حال نہ جاؤں گی۔" میں نے لپک کر پنجرا اٹھایا اور اسے اسی طرح کھینچتا ہوا باہر لایا۔ بعجلت گھوڑے پہ بیٹھا، پیچھے اسے بٹھایا، فتراک میں پنجرے کو باندھا اور گھوڑے کو ایڑ دی۔ رہوار سبک رفتار سرپٹ دوڑا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

اب رات ہوئی تھی۔ چاندنی چہار طرف پھیلی تھی، ٹھنڈک بدن میں اترتی تھی۔ میری رانیں رہوار سبک رفتار کی زین پوش پشت سے چپاں ہوئی تھیں۔ میری پشت میں وہ ہرا بھرا سینہ پیوست ہوا تھا اور بانہیں کمر میں تھیں اور میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ میں عرش میں جھول رہا تھا۔ وہ رات میری شہسواری کا حاصل تھی۔ گھوڑے کی پشت بہشت بنی تھی اور ہم چاندنی میں نہائے ہوئے اوس اور خنکی میں بھیگے ہوئے، باہم چپکے ہوئے اڑے چلے جاتے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ میرا گھوڑا زمین کے سارے رستے طے کر کے کرۂ ارض کو پھلانگ گیا ہے۔

قصہ مرتبان اور گاؤ سوار کا

رات گئے ہم ایک بستی میں وارد ہوئے۔ پوچھتے پچھتے ایک سرائے پہنچے۔ کوٹھری کرائے پہ لی جس میں ایک چارپائی اور ایک میلا سا بستر پڑا تھا۔ اس پرآشوب وقت میں ہم نے اس کونے کو بھی غنیمت جانا۔ بستر بچھایا پھر میں نے تلوار نیام سے نکال درمیان میں رکھی اور دونوں ایک دوسرے کی طرف پشت کر کے پڑ رہے۔

مگر میری آنکھوں میں نیند کہاں۔ کچھ بیتے لمحوں کی سرشاری کچھ قرب نما دوری کی بے قراری، بس ساری رات کروٹیں بدلتے کٹی۔ یوں کروٹیں بدلتا تھا کہ ناگاہ وہ منحوس آواز کہ شہر نامبرا ک میں تڑکے سنائی دیا کرتی تھی کان میں پڑی۔

طوطا مینا دمڑی جی
کوڑی پیسہ دمڑی جی
راجا پرجا دمڑی جی

میں دہل گیا۔ایسی پریشانی ہوئی کہ پھر لاکھ کروٹیں بدلیں نیند نہ آئی۔بیقرار ہو کر اٹھا، باہر نکلا، آسمان قدرے اجل گیا تھا۔ستاروں کا قافلہ گزر گیا تھا، ستارہ سحری چمکتا تھا، رنگ قمر پھیکا ہوا تھا۔اتنے میں مرغ کی بانگ بلند ہوئی اور دور کسی مسجد سے اذان کی صدا اٹھی۔میں نے وضو کر خضوع و خشوع سے فریضہ سحری ادا کیا پھر کوٹھڑی میں آ کر اس گلشن خوبی کو جھنجھوڑا۔وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔جلدی سے سینے کو ڈھانکا اور آنکھیں ملتی نکہت سی میلے بستر سے اٹھی۔منہ ہاتھ دھویا، فریضہ سحری ادا کیا۔پھر جملہ فرائض سے فارغ ہو کر اپنی انگوٹھی اتاری کہ سونے کی تھی اور عقیق اس میں جڑا تھا۔مجھے دی اور کہا کہ بازار جا کر اسے فروخت کر اور کھانے پینے، رہنے سہنے کا بندوبست کر۔

میں بازار میں نکلا تو عجب ماجرا دیکھا۔شہر شہر خموشاں بنا تھا۔بازار کھلے تھے۔خرید و فروخت ہوتی تھی۔پر کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔سودا سلف خریدنا اور چپ چاپ گزر جانا۔نہ ہنسنا قہقہانا نہ بولنا چہکنا۔میں دن بھر بازاروں میں گھومتا پھرا اور یہ منظر عجیب دیکھتا رہا۔شام ہوئی تو دیکھا کہ کوچہ و برزن کے سب لوگ قافلہ در قافلہ خاموش اداس شہر سے باہر جاتے ہیں۔میرا ماتھا ٹھنکا کہ شاید اس میں کوئی بھید ہے تم بھی چلو اور قدرت الٰہی کا تماشا دیکھو، سو میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔

یہ پورا مجمع ایک میدان میں قطار در قطار کھڑا ہو گیا، مگر اسی طرح صورت تصویر خاموش، دفعتاً سب کی نظریں ایک سمت اٹھ گئیں۔کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فرنگی گاؤ سوار ہاتھ میں ننگی تلوار منہ میں کف بھرے جوش و خروش کرتا چلا آتا ہے۔پیچھے اس کے دو الٹے بالوں والے غلام ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں بھی ننگی تلواریں ہیں۔پیچھے ان کے

ایک پہاڑی غلام ہے کہ بڑا سا مرتبان کاندھے پہ دھرے چلا آتا ہے۔ وہ فرنگی قریب آ کر بیل سے اتر ایک تخت پر دو زانو ہو بیٹھا اور ننگی سیف سامنے رکھی۔ پھر غلاموں پہ زبان عجیب میں گرجا۔ وہ لپک جھپک مجمع کی سمت آئے۔ پہاڑی غلام مرتبان سب کو دکھاتا جاتا تھا۔ دیکھنے والے ہراس سے دیکھتے تھے اور آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ایک جواں مرد نے مرتبان کو دیکھ کر نعرہ مارا اور آنکھیں اس کی سرخ ہوگئیں۔ اس پر وہ فرنگی زبان عجیب میں پھر گرجا اور الٹے بالوں والے غلاموں نے اس جوان مرد کو صف سے الگ کر گردن ماری اور لاش کو تڑپتا چھوڑ آگے صف کے سامنے گئے۔ میں سب سے آخر میں کھڑا یہ ماجرا دیکھتا تھا کہ اتنے میں مرتبان میرے سامنے آیا۔ عجب دردناک منظر دیکھا کہ کسی شہزادے کا سر ہے، زلفیں کالی کالی، صورت گوری گوری، تیوروں سے شجاعت ٹپکتی ہوئی، صورت ماہ دو ہفتہ مرتبان کی ظلمت میں چمکتا ہے۔ میرا کلیجہ منھ کو آیا، آنکھوں میں خون اتر آیا، مگر مصلحت اسی میں دیکھی کہ فی الحال ضبط کرو اور گھر چلو۔

میں نے گھر آ کر اس گلشن خوبی کو یہ ماجرا سنایا تو وہ بے تابانہ میرے گلے سے لپٹ گئی اور کاندھے پر سر رکھ کر بے تحاشا رونے لگی۔ میں نے اسے سمجھایا، پچکارا، آنسو پونچھے، تسلی دی۔ وہ دیر تک ہچکیاں لیتی رہی، پھر رقت بھری آواز میں بولی" اے میرے محسن تو جس شہزادے کا سر دیکھ کر آیا ہے وہ میرا ماں جایا ہے۔ یہ ستم زدہ خلقت اسی بدنصیب بادشاہ کی ہے جس کی یہ دختر نحس اختر ہے۔ ماں جایا میرا ہنگام کارزار میں مارا گیا۔ فرنگیوں نے سر اس کا تن سے جدا کیا اور مرتبان میں رکھا۔ باپ میرا زندہ گرفتار ہوا۔ اسے انھوں نے درخت سے لٹکایا اور زندہ جلایا۔"

میں نے یہ افسانہ جگر پاش سنا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر سمند خان آج تنہا تھا، کیا کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ" اے شہزادی دکھیاری غموں کی ماری، ہمارا یہاں قیام خوب نہیں۔ اس نگری سے نکل چلو اور کہیں دور ٹھکانا کرو۔"

کہانی شہر بے چراغ کی

میں نے جلدی جلدی گھوڑے کو کسا، گھوڑے پر اسے ساتھ بٹھا ایڑ دی اور شہر سے نکل کھڑا ہوا۔

ہرج مرج کھینچتے ہوئے صعوبت سفر اٹھاتے ہوئے ہم چلے جاتے تھے کہ ایک شہر میں گزر ہوا۔ اس شہر کا عجب طور دیکھا، عمارتوں اور عمارت والوں کا رنگ بے طور پایا۔ جا بجا محلات و باغات شاہی مگر سب اجڑے ہوئے اندر باہر لاشوں کے پنجر پڑے ہوئے۔ عالی شان امام باڑے مثل جسد امام مظلوم زخموں سے چور، دیواریں گولیوں سے چھلنی، توپوں کے گرابوں سے بھمباقے کھلے ہوئے، گنبد گرے ہوئے۔ لوگ سیہ پوش، خاموش، لب بند، محرمی صورت بنائے ہوئے زبان حال سے مرثیہ خوانی کرتے ہوئے۔ شام پڑی تو لوگ اسی طرح خاموش لب بند اپنے اپنے گھروں کو چلے اور گلی کوچے ہوحق کرنے لگے۔ نہ کوئی دکان کھلی تھی، نہ مکان میں چراغ جلتا تھا، پورا شہر اندھیرا تھا۔ دن کی وہ صورت رات کی یہ کیفیت۔

میں سارے دن تماشائی بنا یہ تماشائے غم دیکھتا رہا تھا، پر اب دامن ضبط ہاتھ سے چھوٹا۔ بڑھ کر ایک سیہ پوش بزرگ سے پوچھا "اے رفیق یہ کیا ماجرا ہے کہ موسم عزا گزر گیا مگر تمھارے شہر نے ماتمی لباس نہیں اتارا۔ بہت سنا تھا کہ اس شہر کے لوگ امام شہید کا سوگ بہ کمال نفاست و شائستگی مناتے ہیں؟ عزاخانے آباد ہوتے ہیں۔ روشنیوں سے جگمگاتے ہیں؟ امام باڑوں میں قندیلیں، مومی شمعیں، دغدغے، جھاڑ فانوس، ہانڈیاں یوں جگمگاتی ہیں کہ سارے شہر میں ان سے روشنی پھیلتی ہے؟ گلی گلی سبیلیں لگتی ہیں، امام تشنہ کام کی یاد میں شربت پلایا جاتا ہے۔ پر یہ کون سا موسم عزا ہے کہ عزاخانے ویران ہیں۔ امام باڑے مسمار ہیں، گلیاں اندھیری ہیں، شہر بجھا پڑا ہے۔"

وہ سیاہ پوش بزرگ یہ کلام سن آبدیدہ ہوا اور آہ سرد بھر کے بولا کہ "اے مہمان عزیز، یہ

شہر بہت غارت زدہ ہے۔ ایام عزا کیوں تمام ہوں کہ تعزیے اب کی برس نہیں اٹھے اور ماتمی پوشاک کیسے اترے کہ ہم اپنے جلاوطن بادشاہ کا سوگ مناتے ہیں اور شہر میں چراغ کیوں کر جلے کہ شہر کا چراغ ہماری ملکہ شہر سے باہر ہے:

خورشید درخشاں امامت ہے سفر میں
گردش نظر آتی ہے اسے دور قمر میں

اے عزیز تو کس زمانے کا ذکر کرتا ہے۔ اب یاں کی زمین اور فلک اور ہوا، کوچے بے ربط ہو گئے، گلیاں بکھر گئیں۔ جو فیض کے دریا تھے خشک ہو گئے۔ شہر پیاسا ہے۔ شہر کے چاند پہ ظلم کی گھٹا چھائی ہے، شہر میں اندھیر مچا ہے، گھروں پہ دوڑیں چلی آتی ہیں۔ مردان حر گرفتار ہوتے ہیں اور گردن مارے جاتے ہیں۔ اے عزیز تو کس موسم میں ہمارے شہر آیا۔ یہ دن وہ ہیں کہ ہمارا شہر ویران ہے تیری کیا خاطر کریں اور کیوں کر حق میزبانی ادا کریں۔ ہماری ملکہ سفر میں ہے۔ شہزادیوں کی خوشبو سے جنگل مہکتا ہے، شہر ترستا ہے۔ گرمی کے دن اور پہاڑوں کی وہ راہیں وہ گوری مورتیں سنولا نہ گئی ہوں گی، چاندسی صورتیں کملا نہ گئی ہوں گی۔"

وہ مرد بزرگ ایک آہ بھر کر چپ ہو گیا۔ پھر سرگوشی میں گویا ہوا "اے عزیز ہماری ملکہ پہاڑوں میں مولا مشکل کشا کا چلہ کھینچتی ہیں، جب وہ چلہ پورا ہو جائے گا تو وہاں سے پلٹیں گی، بادشاہ کو آزاد کرائیں گی اور ہمارے شہر کے دن پھریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ مرد بزرگ جلدی سے آگے بڑھ گیا اور ایک گلی میں مڑ کر گم ہو گیا۔

میں آہ سرد بھرتا کف افسوس ملتا سرائے کو واپس ہوا اور گلشن خوبی سے کہا کہ "اے بی بی ہم شہر مرگ سے نکل کر شہر بے چراغ میں آئے ہیں۔ شہر والے شہریار کو روتے ہیں اور ماتم یک شہر آرزو کرتے ہیں۔" کیفیت اس شہر کی سن کر اسے اپنا شہر یاد آیا اور بہت روئی۔

اے عزیزو باتمیزو جب وہ گلشن خوب روتی تھی تو میرے بدن کے اندر نرم نرم دھاریں سی چلنے لگتی تھیں۔ سپاہیانہ زندگی کی بھاری ذرہ اتر جاتی اور میں سراپا ایک دھڑکتا ہوا دل ایک جلتی پگھلتی لو بن جاتا۔ یہ کیفیت آج مجھ پہ اس شدت سے طاری ہوئی کہ بن بتائے نہ بنے، پر میں نے اپنے دل کے حال کا اظہار برملا کرنا مناسب نہ جانا اور یوں بہانہ بنایا کہ اے نیک بخت، اس شہر متبرک میں آج ہمیں پہلی رات ہے، تیری پاک دامنی ثابت، تیری عصمت مانی مسلم، پر بندہ بشر ہے، برائی کا ہر گھڑی ڈر ہے۔ بدی انسان کے خمیر میں داخل ہے اور خون بن کر رگوں میں دوڑتی ہے۔ جب جسم جاگتا ہے اور خون پکارتا ہے تو یہ تلوار کی گز بھر کی دیوار کیا چیز ہے۔ قبیلہ اور دین و مذہب کی استوار کی ہوئی دیواریں مثل خس اس کی رو میں بہتی دیکھی گئی ہیں۔ کیا ستم ہے کہ دلوں میں وصل ہے اور جسموں میں فصل ہے جب دوری ہے تو یہ قرب کیوں اور یہ قرب ہے تو دوری کیوں؟"

یہ کلام سن کر وہ بہت محجوب ہوئی، چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا، منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے دل میں اپنے تئیں ملامت کی کہ سپاہی زادے تلوار کے وار خوب جانتا ہے۔ محبت کے داؤ پیچ سے محض نا آشنا ہے۔ وار اوچھا پڑا، آخر چوٹ کھائی۔ میں ابھی سوچتا تھا کہ وہ بے تابانہ میرے گلے لگ گئی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میں سمجھا کہ جنت مل گئی، گلے نہیں لگتا ہوں، بہشت میں گلگشت کرتا ہوں۔ مگر اس نے ایک اور پیچ ڈالا۔ بولی کہ اے میرے محسن تو نے یہ کیا سوال کر ڈالا اور مجھے آزمائش میں پھنسایا۔ میرے شہر کا سہاگ لٹ گیا۔ میری حویلی کی آبرو مٹ گئی۔ میں کیوں کر تخت عروسی پر بیٹھوں۔ میں نے یہ عہد کیا تھا کہ اس سورما کی کنیز بنوں گی جو میرے باپ بھائی کے خون کا بدلہ لے اور میرے شہر کو پنجہ فرنگ سے نکالے۔"

اس کلام کو اس سے سن میری سپاہیانہ غیرت نے جوش کھایا، اپنا بھولا ہوا فریضہ یاد

آیا، بولا "اے نیک بخت تو نے میری آنکھیں کھول دیں، بخت خاں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ سمند خاں فتنہ فرنگ کے خلاف اٹھی ہوئی تلوار نیام میں نہیں جانی چاہیے۔ فرنگیوں کے جسم اس کے نیام بنیں۔ میں اس قول کو شبستان محبت میں بھول چلا تھا تو نے مجھے یاد دلایا۔ اب میں بخت خاں کی تلاش میں نکلتا ہوں کہ وہ مقرر شیر شاہی مینار کی تلاش میں ہوگا۔ جب نقارے کی آواز تیرے کان میں آئے تو جاننا کہ تیرے باپ بھائی کے انتقام کا وقت آیا اور فتنہ فرنگ ٹلا۔"

وہ رات ہماری آخری رات تھی۔ رات گئے تک ہجر کی راتوں کی سوچتے رہے اور آنے والے وصال کے لمحوں کی باتیں کرتے رہے جانے کس وقت سوئے اور کیسے سوئے کہ درمیان میں تلوار رکھنا بھی بھول گئے۔

سفر سر پہ سوار تھا۔ تڑکے آنکھ کھل گئی۔ جانا کہ لمس کا ایک طلسم تھا کہ ٹوٹ گیا۔ خلد کی سیر کرتا تھا کہ نکالا گیا۔ تاروں کی چھاؤں میں گھوڑے کو کسا، اس گلشن خوبی کو گلے لگایا اور گھوڑے پہ سوار ہو سفر پہ چلا۔

شہر سے نکلا تو فجر ہو چکی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے، بارش ہو چکی تھی۔ اب ترشح ہوتا تھا۔ دور سے صدا آتی تھی۔

ندی نربدا کا جل گرجے، گرجے گنگا دھار

برسات لگ چکی تھی۔ آج ساون کی پہلی جھڑی تھی، آلھا اودل پڑھی جارہی تھی۔"

سمند خاں یہاں تک سنا کر خاموش ہو گیا۔ دیر تک اسی طرح دو زانو بیٹھا رہا۔ صورت تصویر خاموش حاضرین سکتے میں تھے۔ پھر بولا "اے عزیزو، بخت خاں ابھی زندہ ہے اور شیر شاہی مینار کی جستجو میں ہے جب نقارے کی آواز کان میں آئے تو جاننا کہ بخت خاں کے لشکر کے کوچ کا وقت آیا اور سمند خاں تمہاری گلی سے اٹھا۔"

سمند خاں جلدی سے اٹھا اور نعرہ لگاتا ہوا مطب سے نکل گیا۔

ندی نربدا کا جل گرجے، گرجے گنگا دھار

اس کے بعد ہم نے سمند خاں کو نہیں دیکھا۔

حکیم جی چپ ہو گئے۔ غنی، صدیق، نصیر، عدالت علی بھی خاموش ہو گئے۔

پھر غنی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا" کہاں گیا وہ۔"

"اللہ جانے" حکیم جی بولے "اللہ جانے کہاں گیا۔" خاموش ہوئے، پھر بولے "اس رات ہماری گلی میں بہت گرفتاریاں ہوئیں۔ میرے پاس بھی کوتوال آیا تھا۔ مگر اپنا شہر میں اعتبار تھا سو بچ گیا۔"

عدالت علی خاموش حقہ پیتے رہے۔ پھر نے حکیم جی کی طرف موڑ دی۔

غنی بولا "حکیم جی، بخت خاں سچ مچ زندہ ہے؟"

حکیم جی نے نے کو ہونٹوں میں لیتے لیتے چھوڑا، بولے کہتے یہی ہیں کہ بخت خاں اب تک زندہ ہے۔

"مگر کیسے زندہ ہے؟" صدیق نے سوال کیا۔

حکیم جی بولے "دوستو، دنیا حیرت کا کارخانہ ہے، زندگی طلسم ہوشربا ہے۔ اس کارخانے کا راز کس نے پایا اور اس طلسم کا بھید کس نے بوجھا۔ یوں موت سے کسی کو رستگاری نہیں۔ جو آیا ہے وہ جائے گا۔ پر قدرت کبھی کبھی یہ شعبدہ بھی دکھاتی ہے کہ موت کو زندگی کے مقابلے میں ہارنی ہراتی ہے۔ یوں سنا ہے کہ جب بخت خاں دلی سے نکلا تھا تو ایک قریہ سے گزرتے ہوئے ایک گھوڑے کی ہنہنانے کی صدا ئے عجیب اس کے کان میں آئی تھی مگر اس نے اس صدا پر غور نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ تب ایک فقیر اسے راہ میں ملا اور بولا "بخت خاں تیرا بخت برا ہو کہ ٹیپو کے گھوڑے کی صدا تو نے نہیں سنی۔ تیری فتح کا وقت ٹل گیا۔ اب گردش دوراں تجھے دشت دشت آوارہ پھرائے گی اور پہاڑوں میں خراب کرے گی۔ پر تو اس آواز کے باعث موت کے چکر سے نکل

گیا ہے کہ جب پھر یہ آواز آئے تو کان دھرنا اور اس سمت جانا۔"

غنی نے پوچھا "حکیم جی ٹیپو سلطان کے گھوڑے کی یہ کیا کہانی ہے۔ وہ قریہ کون سا قریہ تھا۔ وہ آواز کیسی آواز تھی؟"

حکیم جی بولے "دوستو یہ کہانی لمبی ہے اور رات چھوٹی ہے۔ گجر بارہ کا بج گیا۔ نیند کا بلاوا آگیا۔ آج کی رات کے لیے یہ سبھا برخاست کرو۔

کل رات کو اب ختم یہ افسانہ کریں گے۔

گھوڑے کی ندا

ایک دن دھوپ تڑاقے کی پڑی، دوسرے دن بادل گھر کر آئے اور برس پڑے، رات کو چارپائیاں پھر اندر چلی گئیں اور سونے والے مئی کی راتوں میں چھتوں کے نیچے رضائیاں تان کر سوئے۔ موسم کا یہ فساد نصیر کی دانست میں ایٹم بم کا کرشمہ تھا۔ غنی کہتا تھا کہ موسم کسی ملک میں سدا ایک سے نہیں رہتے۔ صدیوں موسموں کا دور یوں چلتا ہے کہ کبھی نہیں ٹوٹے گا اور پھر ٹوٹ جاتا ہے مگر عدالت علی کے تئیں یہ قہر کی صورت تھی" ایک ایٹم بم چھوٹنے سے جاڑے گرمی برسات سب کا قرینہ بگڑ گیا مگر بھائی آسمان کی طرف بھی دیکھا کرو کہ وہاں ان دنوں کیا کہرام بپا ہے۔ دم بدم تارے ٹوٹتے ہیں۔ کیا آسمان پر کسی نے ایٹم بم چھوڑ دیا ہے" جب دمدار ستارے کی خبر آئی تو ان کی دلیل کو اور تقویت حاصل ہوگئی۔ بولے "کسی کو یاد ہو نہ ہو ہم نے جاڑوں میں آسمان کو دیکھ کے کہہ دیا تھا کہ بھائی سنہ ستاون آرہا ہے، آثار اچھے نہیں۔ پچھلی رات کو مریخ انگارے کی طرح دہکتا تھا۔ میاں ہماری یہ عمر ہونے کو آئی کبھی ہم نے مریخ کو یوں پھیلتے دہکتے نہیں دیکھا۔ وہ تو ایسے پھیل رہا تھا کہ میں سمجھا سورج کے برابر ہو جائے گا۔ اب مریخ میں ایٹم بم کس نے چھوڑ دیا۔" اور حکیم جی کا تخیل بھٹکنے لگتا۔ حاضر کی حدیں پھلانگ کر ماضی کی دنیا میں کہیں سے کہیں پہنچا۔ گزری ہوئی باتیں اور یادیں، ادھ بسری داستانیں، بھولے ہوئے لوگ، ڈور کا ایک سرا مل جاتا اور پھر ریل کھلتی چلی جاتی۔ طوطے میاں کے والد عمامہ سر پہ رکھے، عبا دوش پہ ڈالے عصا ٹیکے بیچ صحن میں کھڑے ہیں اور ستاروں کو دیکھتے

ہیں۔طوطے میاں آم کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے۔کبھی طوطوں کو روٹی کے ٹکڑے کھلاتے ہوئے۔کبھی ارد گرد بیٹھے ہوؤں کو اپنے معرکے سناتے ہوئے۔داستان اور حقیقت کے درمیان وہ جو باریک سا فرق ہوتا ہے وہ حکیم جی کے ذہن میں تقریباً مٹ چکا تھا۔داستانوں اور قصوں کے جانے کتنے منظر اور کتنے لوگ داستانوں سے نکل کر ان کے لیے دیکھی بھالی چیزیں بن گئے تھے اور کتنے واقعات تھے کہ ان کے نزدیک محض افسانے تھے۔طوطے میاں کے والد کو انھوں نے ہمیشہ یہ جانا کہ انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے حالانکہ انھوں نے تو بس ان کا قصہ طوطے میاں سے سنا تھا اور طوطے میاں کا ذکر حکیم جی یوں کرتے گویا کوئی داستان سناتے ہیں حالانکہ انھیں انھوں نے چلتے پھرتے اور بولتے چالتے دیکھا تھا لمبے لگ لگ سے۔کبھی ضرور حسین ہوں گے مگر اب ہڈیوں کی مالا تھے۔

رنگ و روپ بگڑ چکا تھا،بس آنکھوں میں دم باقی تھا۔دبلے پتلے چھڑی ایسے بدرنگ گوری جلد جھریاں پڑی ہوئیں،بڑی بڑی آنکھیں،سفید بال،عربی پٹے رکھے ہوئے لیکن میل میں گندھے ہوئے۔شہر سے باہر کربلا کے حجرے میں رہتے تھے۔حجرے میں قیام برائے نام تھا۔حجرے کے مقابل والے آم کے پیڑ کے نیچے بسرام تھا۔رات کو ستاروں کو تکتے رہنا۔آموں کے دنوں میں کربلا والے باغ میں دن بھر گوپیا گھومتی اور طوطوں کو اڑایا جاتا۔طوطوں کی ڈاریں گھنی شاخوں سے نکل کر سبز لہکتی دھاریاں بن کر فضا میں پھیل جاتیں اور پھر طوطے میاں کے پیڑ پہ اتر پڑتیں۔کبھی کسی رکھوالی کی یہ مجال نہ ہوئی کہ طوطوں کو اس درخت سے اڑاتا۔بستی والے بہت کھانا لے کر آتے مگر طوطے میاں کے حصے کا رزق اس میں کم ہوتا کچھ کربلا کے آس پاس پڑے ہوئے محتاجوں کو ملتا، کچھ ان بندروں کے پیٹ میں پہنچتا جو کربلا کے سیاہ ہوتے خستہ برجوں پر جھولتے رہتے کچھ ٹکڑے اس کتے کے پیٹ میں جاتے جو راتوں

کو کبھی باغ میں کبھی باغ سے دور بھونکتا پھرتا اور طوطے میاں کے مراقبہ میں سخت خلل ڈالتا۔ باقی اس جنگل کے طوطوں کا رزق تھا۔ طوطے میاں رات کے کھانے میں سے بہت سی روٹیاں بچا لیتے اور جب فجر کا تارا نمودار ہوتا تو ان باسی روٹیوں کو ہاتھ لگاتے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ریزے کرتے۔ یہ شغل جاری رہتا۔ یہاں تک کہ کالونس آسمان سے ڈھلنے لگتی اور درختوں پر دھندلا دھندلا سفید غبار نظر آتا اور طوطے قریب و دور کے درختوں سے اڑ اڑ کر آتے اور طوطے میاں کے گرد چک پھیریاں کاٹنے لگتے۔ چیختے چلاتے طوطوں کی ڈاریں زمین میں بچھی ہوتیں۔ درمیان میں طوطے میاں کھڑے ہوئے روٹی کے ریزے بھر بھر مٹھی بکھیرتے ہوئے! کوئی طوطا بے قرار ہو کر ڈار سے بچھڑ طوطے میاں کے کاندھے پہ آبیٹھتا اور لمبی دم اس کی طوطے میاں کے کان کو چھونے لگتی، مگر وہاں کچھ نہ پا کر پھر زمین میں پھرتے ہوئے طوطوں میں جا شامل ہوتا۔ حکیم جی کی آنکھوں کے سامنے وہ پورا منظر آجاتا۔ پھر انھیں وہ دن، وہ درخت، ان درختوں کے پرندے یاد آنے لگتے۔ طوطے میاں کی باتیں یاد آنے لگتیں۔

''میاں اب یہ باتیں کہاں''، حکیم جی سوچتے سوچتے آپ ہی افسردہ ہو جاتے''نہ وہ لوگ رہے نہ وہ محبتیں مروتیں رہیں۔ اب تو آدمی آدمی میں غیریت ہے، پرندوں بے چاروں کی تو ہستی کیا ہے'' چپ ہو جاتے۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرتے'' ایسے طوطا چشم ہو گئے ہیں لوگ کہ کوئی مرتا ہو تو حلق میں بوند پانی کی نہ ڈالیں، پڑوس میں میت پڑی ہو تو کاندھا نہ دیں''، حکیم جی ٹھنڈا سانس بھر کے پھر چپ ہو جاتے اور لمبی چپ سادھ لیتے۔ وہ پھر کسی دور کی دنیا میں نکل جاتے۔ طوطے میاں کا کربلا کے آس پاس پڑے فقیروں کی خیر گیری کرنا، بیمار پڑیں تو دوا دارو کرنا، درخت درخت طوطوں کی خبر لیتے پھرنا یاد آتا۔ پھر ان کے ذہن میں وہ واقعہ ابھرنے لگتا کہ صبح ہی صبح جب طوطے میاں طوطوں کو روٹی کے ٹکڑے کھلانے شروع ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آم کے پیڑ تلے عین اس

پودے کے نیچے جس کی کھکھل میں ایک طوطے کا گھونسلا تھا۔طوطا لکڑی کی طرح سخت مرا پڑا ہے۔شاید اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔لوگ اس روز بہت حیران ہوئے کہ طوطے میاں نے آج کربلا کی ٹھیک کیوں چھوڑی اور شہر میں کیسے نکل آئے۔طوطے میاں نے اکنی اکنی دوانی دوانی بازار والوں سے چندہ جمع کیا پھر لٹھا اور کافور خریدا۔واپس آئے،میت کی تجہیز وتکفین کی۔آم کے پیڑ کے نیچے طوطے کی تدفین ہوئی اور طوطے میاں شام تک قبر پہ بیٹھے قرآن خوانی کرتے رہے۔

"اس روز جب ہم رات کو ان کے پاس جا کر بیٹھے"،حکیم جی افسردہ لہجہ میں کہنے لگے"توانھیں بہت ملول پایا۔ازبسکہ طبیعت بھری ہوئی تھی،ہماری باتوں پہ بھکنے لگے اور اپنی داستان لے بیٹھے۔عجب طور کی داستان تھی کہ ہم بھی ملول ہو گئے۔وہ رات ہم سب ہی پہ بھاری گزری۔"

"ہاں صاحب آدمی وہ عجب تھا۔"عدالت علی بولے۔

"مگر بھائی یہ ٹھہرے نئی روشنی کے لوگ۔"حکیم جی نے غنی اور نصیر کی طرف اشارہ کیا۔"انھیں تو اس کا قصہ بے سروپا نظر آئے گا۔"

عدالت علی بولے"حکیم جی ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو قصہ سچا ہوتا ہے وہی بہت بے سروپا لگتا ہے۔"

غنی اور نصیر نے جب یہ قصہ سننے پر اصرار کیا تو پھر حکیم جی سنبھل کر بیٹھ گئے۔حقے کے لمبے گھونٹ لئے،پھر بولے"عذاب ثواب کہنے والے کی گردن پر۔حاشا وکلا میں نے اپنی طرف سے اس میں ایک لفظ شامل نہیں کیا ہے،جو سنا وہ عرض کرتا ہوں۔طوطے شاہ کی طبیعت میں طوطے کی موت نے گداز پیدا کر دیا تھا۔زندگی کی ناپائیداری اور زمانے کی بے ثباتی کا ذکر کرتے کرتے انھوں نے اپنا ذکر شروع کر دیا۔

داستان طوطے میاں کی

صاحبو، آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں۔ کل ہم شہرِ گل کی زینت تھے۔ نازوں میں پلے تھے۔ پھولوں میں تلے تھے۔ اس شہر کا قصہ شنیدنی ہے کہ چشمِ فلک نے دنیا کے تختے پر کاہے کو ایسا چمن پھولتے دیکھا ہوگا۔ راہیں خوشبو محلے گلزار، گلیاں معنبر، بازار منور سقے کٹورا بجاتے ہیں، چھاگلیں لیے پھرتے ہیں۔ بزاری ہزاری رونق کی گرم بازاری، دکانوں میں قیمتی اشیاء سجی ہیں۔ چاندنیاں بچھی ہیں۔ دم کے دم میں لاکھوں کا مول ہوتا ہے مول کرنے والے دولت کو ہاتھ کا میل جانتے ہیں، مال اسباب خریدتے ہیں، تاجروں کو مالا مال کرتے ہیں۔ جو مال نہیں رکھتے وہ دل کا سودا کرتے ہیں۔ دولت کی گنگا کے پہلو بہ پہلو حسن کی جمنا بہتی ہے۔ سویرے منھ اندھیرے چاند ایسے چہرے، آنکھوں میں میٹھی نیند بھرے، کچھ سوتے کچھ جاگتے، قدم لڑکھڑاتے، جمائیاں لیتے، آنکھیں ملتے موج موج گھاٹ کی طرف جاتے ہیں۔ اشنان کی کیا شان ہے کہ گھاٹ پہ سونا لٹتا ہے، پانی کی پگھلی چاندی میں ستارے اترتے ہیں، بھیگی ساڑھیوں میں کندن بدن دمکتے ہیں۔ سیمیں ساقیں ریشمیں ساعدیں ڈھل کر چمک مارتی ہیں۔ مہین ساڑھیوں کے شرابور آنچل کہیں پھسل پڑتے ہیں، کہیں چپک کر گلابی جوبنوں کو دمکاتے ہیں۔ جوبنوں کے گلاب پھولے ہیں، گلابی گال الگ بہار دکھاتے ہیں۔ گھڑے رس کے بھرے چور تکیں لے نہ سکیں۔ امی جمی کا زمانہ تھا صبح خیزیوں چوٹوں، اچکوں کا بازار سرد تھا، عزت داروں کی عزت وضع داروں کی وضع قائم تھی۔

ہم جوانی کے نشے میں سرشار مٹر گشتیاں کرتے تھے۔ کبوتر اڑاتے تھے۔ کیا کیا کبوتر جمع کیا تھا۔ جب بھرا کھا کر ٹکڑی اڑتی تھی تو جانو کہ گھنگھور گھٹا اٹھتی تھی۔ صاحب، مبالغہ نہ جاننا، جب دھوپ تیز اور گرمی سخت ہوتی تھی تو والدہ حضرت فرماتیں کہ بیٹا کبوتر ذرا چھوڑ دو۔ کچا کوٹھا کہ خاص کبوتروں کے لیے بنوایا تھا اس کا دروازہ کھولا جاتا اور

کبوتروں کے دل کے دل پر پھٹپھٹاتے یوں نکلتے کہ بادل اٹھ رہے ہیں اور دم کے دم میں آنگن میں چھاؤں ہو جاتی۔ ہوا کبھی بند ہوتی تو پھر والدہ حضرت فرماتیں کہ بیٹا ہوا بند ہے۔ کبوتر کھولو اور جب کبوتر کھلتے تو جانو کہ پنکھے چل پڑے۔ ان کے بازوؤں سے وہ ٹھنڈی ہوا پیدا ہوتی کہ پسینے سے شرابور بدن شگفتہ ہو جاتے۔

صاجو، وہ کبوتر ہم سے چھٹ گئے۔ لقا، لوٹن، گولا، جوگیا، شیرازی، للسری، القصہ طرح بہ طرح رنگ برنگ کبوتروں سے بھرا کوٹھا اسی طرح چھوڑ آئے اور اب اپنی پھڑ سے جدا، اپنی چھتری سے دور بھٹکتے ہیں اور اونچی چھتوں کو ترستے ہیں۔ اس آسمان کے لیے پھڑ کتے ہیں۔ مہینہ وہ مارچ کا تھا، جاڑے کی سواری جاتی تھی، دن اور رات کا فرق کم ہوتا جاتا تھا۔ اے صاجو دو موسموں کا ملنا اور دن اور رات کا برابر ہو کر وصل کرنا قیامت ہوتا ہے۔ ماہ مارچ پر غور کرو کہ کیونکر بربادی اور آبادی کا کھیل پہلو بہ پہلو کھیلا جاتا ہے۔ ملتے موسم کیا نیرنگی دکھاتے ہیں کہ ایک شجر پر ثمر پہ بہار کی بارات چڑھی ہے۔ شاخوں نے پھولوں کا گہنا پہنا ہے، پتوں میں تاشا باجا بجتا ہے۔ بغل میں اس کے شجر ایک دوسرا ہے، بے ثمر بے برگ و بر، سر برہنہ بے ملبوس شاخیں سوئے فلک تکتی ہیں اور کسی کسی ٹہنی سے باگا کوئی پتا، زرد رو وغمزدہ، ان انگنت رفیقوں کو یاد کر ہاتھ ملتا ہے جو قافلہ در قافلہ شاخوں کی بستیوں سے رخصت ہوئے اور اب زمین کی پستی میں دربدر خاک بسر نوحہ بلب بھٹکتے پھرتے ہیں اور جہاں جا پاتے ہیں سر سے سر جوڑ جمع ہو ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

مہینہ وہ مارچ کا تھا۔ اے صاجو جاڑا ابھی بہت ستاتا ہے۔ پر گلابی جاڑا قہر ہے کتنی کہانیاں ساتھ لاتا ہے۔ کتنی کہانیاں ساتھ لے جاتا ہے۔ بسنت دن ہوئے گزر چکی تھی ہولی ابھی جلی تھی اور سونے والے بند کوٹھوں سے نکل دالانوں میں آ گئے تھے۔ آموں کے باغوں میں ہر سمے خوشبو تیرتی رہتی اور بھونرے مول کے گچھوں کے گرد منڈلاتے بھنبھناتے رہتے۔ وہ مہینہ مارچ کا تھا اور دن وہ نوروز کا تھا۔ دھوپ ڈھلنے لگی

تھی، چوکی چھاؤں میں بچھی تھی، صحن صاف، چوکی شفاف، اجلی چاندنی، اجلی چاندنی پہ اجلا گاؤ تکیہ۔ والد ہمارے، نورانی چہرہ برف رنگ ریش، سفید لباس، دو پلوٹوپی سر پر، عبا دوش پر، دو زانو بیٹھے تھے ہاتھ میں جنتری کھلی تھی اور سامنے ایک تسلا پانی سے بھرا کہ بڑا پھول ایک گلاب کا پڑا اس میں تیرتا تھا۔ ایک طرف گلاب کے پھولوں سے بھرا طشت، دوسری طرف اجلے سفید چینی کے ایک طشت میں سیہہ کے کانٹے کا بنا قلم، برابر میں چینی کی پیالی گھلے زعفران سے بھری اور برابر میں اس کے سفید کاغذ کے پرزے، بڑی کوڑی ان پہ دھری ہوئی۔ جاننا چاہیے کہ والد ہمارے بڑے عامل تھے اور نجوم و جفر میں درک رکھتے تھے۔ برس کے برس بروز نوروز اسی وضع تشریف فرما ہوتے اور جب ساعت خاص نوروز کی پہنچتی اور لگن میں تیرتا گلاب دفعتاً چکر کھاتا تو وہ دو زانو ہو زعفرانی روشنائی سے سفید کاغذ پر تعویذ لکھتے۔

ہاں تو جنتری ان کے ہاتھ میں کھلی تھی۔ چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ جنتری دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے، نوروز کا رنگ اب کے سرخ ہے، ہاتھ میں تلوار شیر پہ سوار آیا ہے۔"

والد ماجد کی زبان مبارک سے یہ کلمات سن کر دل جانے کیوں دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ مگر پھر ہم شغل سے لگ گئے۔ رنگ کی پچکاری لیے اندر باہر نوروز کھیلتے پھرتے تھے۔ جو سامنے آجاتا تھا بے دھڑک رنگ کی پچکاری اس پر چھوڑتے تھے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس پر بھی۔۔۔ اے صاحبو، ہم یہ بتانا بھول گئے کہ جس محلہ میں ہمارا گھر تھا۔ اسی محلہ میں ایک حکیم ضامن علی رہتے تھے۔ گورے چٹے، دہرا بدن، سدا ململ پہنتے تھے۔ ماہوٹوں کے جاڑوں میں بھی یہی طور دیکھا کہ خالی ململ کا کرتہ پہنے مطب کرتے ہیں اور برف میں لگی کچی صراحی کا پانی پیتے ہیں۔ گھر میں ان کے ایک دختر تھی، نیک اختر، خوش ترکیب، خوش رنگ، نام شہزادی محل تھا کہ وہ گورا بدن سچ مچ

مرمر کا ایک محل تھا۔ قد اونچا بدن چھریرا، چہرہ گلابی نقشہ کتابی، ماتھا کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی، زلفیں گھنی گھنی سدا سفید چکن پہنتی ماسوا موسم عزا کے کہ ان ایام میں وہ شعلہ جسم سیہ پوش ہوتا اور مہتاب ایسا چہرہ خوب دمکتا۔ ساتھ کھیلتے بڑے ہوئے تھے اور اکیلے وکیلے ساتھ رہے تھے۔ سو درمیان میں نہ کوئی حجاب تھا نہ روک ٹوک تھی۔ پر ذرا شعور نہ تھا کہ کیوں ساتھ کھیلتے ہیں۔ ہاں جب کھوے سے کھوا چھو جاتا تو جی چاہتا کہ ایک بار پھر چھو جائے اور بالشت سے بالشت ناپتے تو پھر بار بار ناپتے اور جان کر طے نہ کرتے کہ کس کی بالشت لمبی ہے۔ تو اس روز بھی بے شعوری ہی میں سب کچھ ہوا۔ ہم نے رنگ بھری پچکاری آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پہ چھوڑ دی وہ چہرہ رنگ سے بھیگا اور ہلکا سفید لباس شرابور ہو کر شانے اور سینے سے چپکا اور گورا بدن اندر سے جھلکا تو دل بہت چھلکا اور جی چاہا کہ پچکاری کی دھار لگاتار چلتی رہے اور رنگ چھلکتا رہے کہ زمین و آسمان اس میں بہہ جائیں۔ پر وہ لذت ایک ساعت کی تھی کہ یکا یک نظر والد ماجد پر پڑی جنہوں نے نظریں اٹھا کر ہمیں دیکھا اور بغیر کچھ کہے پھر جنتری پر نظر جما لی۔ وہ لذت اس نظر کے ساتھ بہہ گئی۔ پچکاری ہاتھ میں کھینچی کی کھینچی رہ گئی۔ دل بیٹھنے لگا۔

اس روز سے آمد و رفت اس مہ لقا کی گھر میں ہمارے بند ہوئی، جی کو ہمارے روگ لگا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا۔ دن بھر کوٹھے پہ بیٹھا رہتا اور کبوتر اڑاتا رہتا۔ کبوتروں کے ساتھ نگاہیں آسمان پر بھٹکتی رہتیں۔ مگر پھر آسمان بھی تنگ ہونے لگا اور تنگ ہوتے ہوتے اپنے تئیں مانند بیضہ مور کے رہ گیا۔ صاحبو آسمان ان دنوں اپنی زد میں تھا۔ نشیب وفراز کی نگاہ میں تھے۔ ان دنوں آسمان نے بہت رنگ بدلے اور ستارے ان گنت ٹوٹے۔ رات بھر ستارے یوں ٹوٹتے گویا توپوں کے گولے چلتے ہیں اور آسمانوں میں کوئی معرکہ پڑتا ہے لگتا کہ ایک ایک کر کے ستارے ٹھنڈے پڑ جائیں گے اور دشت فلک خالی ہو کر ہو حق کرے گا۔ والدہ حضرت کو زور تشویش تھی۔ ہر مرتبہ

جب ستارہ ٹوٹتا تو لاحول پڑھتیں، کانپ جاتیں اور تشویش کا کلمہ زبان پر لاتیں کہ "بی بی اللہ اپنا رحم کرے۔ کچھ ہونے والا ہے۔" اور میرے پدر بزرگوار عصا لے کر بیچ صحن میں کھڑے ہو جاتے۔ عصا ٹیکے نگاہ سوئے آسمان کیے گھنٹوں ساکت وصامت کھڑے رہتے گویا ٹھنڈے ہوتے ستاروں کا شمار کرتے ہیں۔ یا باقیوں کی تعداد کرتے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک روز سوال کیا کہ "اے پدر بزرگوار آپ یہ کیسی چلہ کشی کرتے ہیں کہ رات گئے تک ایک پہلو کھڑے ستاروں کو تکتے رہتے ہیں۔ وہاں آپ کیا دیکھتے ہیں اور ستارے آپ سے کیا کہتے ہیں۔"

تب پدر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے کہ "اے پسر، جو کچھ زمین پہ ہوا چاہتا ہے وہ میں آسمان پر دیکھتا ہوں، ستاروں کا عالم بیکراں ہے، ان کی گردش فسانہ زمین و زماں ہے۔ اس زمین پر جتنے ساحل ہیں اور ساحلوں پر جتنے کنکر پتھر ہیں اتنے آسمان پر ستارے ہیں کہ مانند سفینوں کے آسمان کے سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ مگر کیا انتظام ہے کہ نہ آپس میں ٹکراتے ہیں نہ برابر سے گزرتے ہیں۔ قافلہ نجوم کا ہر مسافر اکیلا ہے کہ بے سنگھی ساتھی بے توشہ و زادِ راہ حیراں بیابانِ فلک میں بھٹکتا پھرتا ہے اور گمنام بے منزل راستوں کو طے کرتا چلا جاتا ہے۔ کتنے مسافر ہیں کہ بیابان فلک میں جانے کدھر گم گئے۔ مگر نشان ان کے جوں کے توں باقی ہیں اور منور خوشبو ان کی اسی طور فضا میں تیرتی ہے۔ اے جانِ پدر ان سدھارے ہوئے مسافروں کی منور خوشبو سے آسمان جگمگ کرتا ہے اور زمین کے مسافروں کو کہ رات کو سفر کرتے ہیں رستہ دکھاتا ہے۔"

پدر بزرگوار کی بات میں نے کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی، پر اس راہ مجھے ستارہ اپنا یاد آیا کہ آنکھوں سے اوجھل تھا پر منور خوشبو اس کی تصور کے آسمان میں تیرتی تھی اور اسے عرش منور بنائے ہوئے تھی۔ گھر سے سو باری گلی میں آنا، ادھر جانا اور حیران ہونا اور پلٹ کر گھر آ جانا، پھر بوتروں کے بہانے کوٹھے پہ جانا اور اس بام بلند اور اس زینے کو تکتے

رہنا، پر ہماری قسمت کے ستارے کی نمود کسی صورت نہ ہوئی اور فلک پہ ستارے اسی طور ٹوٹتے رہے اور ہمارے والد اسی وضع سے عصا کمر سے ٹیکے آسمان کو رات گئے تک تکتے رہے تا آنکہ مہینہ ستمبر کا آپہنچا۔ موسموں کے وصال و فراق کا مہینہ۔ صاحبو وہ ستمبر ہی کی شب تھی۔ اس شب پدر بزرگوار بہت رات تک صحن میں کھڑے رہے، پھر صحن سے کوٹھے پر چلے گئے اور اونچی منڈیر پہ عصا ٹیکے ایک پہلو پہ کھڑے ساکت و صامت دیر تک سوئے فلک دیکھتے رہے۔ اس شب آسمان پر بہت کہرام مچا اور ستارے کچے بتاشوں کی رطح ٹوٹے۔ پھر ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا کہ چکا چوند سے اس کی سارا شہر چمک اٹھا اور سوتوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پدر بزرگوار چھت سے نیچے اتر آئے۔ آہستہ آہستہ کہتے جاتے تھے وتعز من تشاء و تزل من تشا۔ اور زینے سے اترتے جاتے تھے۔ پھر وہ صحن سے گزر کر اپنے حجرے میں چلے گئے اور صبح تک سجدے میں پڑے رہے۔

صاحبو اس رات کے بعد سے حضرت والد صاحب حجرے سے نہیں نکلے۔ سجدے اور تلاوت قرآن ان کا وظیفہ ٹھہرا۔ دن اور رات اسی وظیفے میں گزرتے۔ جانماز بچھی ہوئی رحل شریف پر کلام پاک رکھا ہوا اور پرے اس سے ننگی سیف دھری ہوئی، سفید ریش آنسوؤں میں تر بتر، رقت کی کیفیت طاری، زبان پہ آیات قرآنی جاری۔

ایک روز عجب ہوا۔ والدہ حضرت تڑکے سے بے آرام ہوگئیں۔ حجرے کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ پدر نے حجرے کی کنڈی کھولی اور والدہ حضرت کو دیکھا کہ مثل بید کانپتی ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ فرمانے لگیں "اللہ رحم کرے، جلالی خواب دیکھا ہے دیکھا کہ بہت لمبا جلوس ہے، سر کھلے ہوئے گریبان پھٹے ہوئے بڑا علم نکلتا ہے۔ خون اس سے ٹپکتا ہے۔" والد ماجد نے تعبیر اس خواب کی کچھ نہ دی اور زبان سے کوئی حکم ارشاد نہ فرمایا۔ ٹھنڈی سانس بھری وتعز من تشاء وتزل من تشاء کہا اور پھر کلام پاک پہ

جھک گئے۔

والدہ حضرت ڈولی کرا کر چھوٹی درگاہ پہنچیں اور ضریح کو پکڑ کر دن بھر روتی رہیں مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ہاں جب دونوں وقت ملتے تھے اور درگاہ میں قندیلیں روشن ہو رہی تھیں تو اس جناب کو غنودگی آ گئی۔ دفعتاً ٹاپوں کی آواز کان میں آئی کہ ساری درگاہ گونج گئی اور در و دیوار پہ رعب و جلال طاری ہو گیا۔ والدہ حضرت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں مگر سواری گزر چکی تھی۔ امام باڑے کے پکے فرش پہ سم کا ایک بڑا سا نشان دکھائی دے رہا تھا کہ مثل بدر کے ضو دے رہا تھا۔ والدہ حضرت نے قدم شریف کو بوسہ دیا۔ پھر بڑے علم کا پٹکا اپنی آنکھوں سے مل مل کر بہت گریہ کیا اور رات پڑے مطمئن و آسودہ گھر واپس آئیں اور آرام کیا۔

صاحبو اب یہ ماجرا سنو کہ تیسرے دن پھر صبح کے ہون میں والدہ حضرت بے آرام ہوئیں اور کان میں ٹاپوں کی آواز پھر آئی۔ تب انھیں تشویش ہوئی اور سوچ میں پڑیں کہ یہ بشارت ہے یا کسی آفت کی سناونی ہے۔ اس جناب نے حضرت والد صاحب کے سامنے یہ سوال ڈالا۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا، یہ رموز الٰہی ہیں اور بندوں کو ان میں کلام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر وہ سجدے میں چلے گئے اور والدہ حضرت حجرے سے باہر نکل آئیں۔

اس روز شہر میں ایک کہرام پڑا۔ دیکھا کہ ایک شہسوار شہر میں وارد ہوا ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ بس اس کے مرکب کی ٹاپوں کی آواز کسی کسی کان میں آتی ہے۔ یہ آواز ندا بن جاتی ہے جو یہ آواز سنتا ہے۔ اس پر ایسا جنون طاری ہوتا ہے کہ ہتھیار سجا کر رن کی راہ لیتا ہے۔ عجب آواز ہے کہ اس کا سننے والا رو کے نہیں رکتا۔ مارو باندھو رسوں میں باندھ کر رکھو مگر رسے تڑا سارے بندھن توڑ ہتھیار باندھ گھوڑے پہ بیٹھ تیر کی طرح زن سے رن کو جاتا ہے۔ یوں شہر کے بہت سے جوان گھروں سے نکل گئے اور بولتے ہوئے

رن میں گم ہو گئے۔

والدہ حضرت نے یہ خبریں سنیں تو اور سراسیمہ و مضطرب ہوئیں۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک شب چھوڑ کر پھر تڑکے کے سمے ہڑبڑا کر اٹھیں اور مجھ سے فرمایا کہ بیٹا سواری نکلتی ہے پھر بید لرزاں کی مانند کانپنے لگیں اور ہراس سے بولیں "کیا پر جلال سواری ہے کہ در و دیوار ہلتے ہیں اور ٹاپوں کی دھمک سے گلی گلی گونجتی ہے۔" اس کلام سے مجھے عجب پریشانی ہوئی اور سارے دن بیکل و مضطرب رہا۔ جب شام ہوئی اور شمعیں روشن ہوئیں تب میری پریشانی سوا ہوئی۔ دامن ضبط ہاتھ سے چھوٹا اور حضرت والد صاحب کی خدمت بابرکت میں مودب حاضر ہو یوں عرض پرداز ہوا کہ "اے پدر بزرگوار آپ پر سے میری جاں نثار ہو۔ اجازت ہو تو بندۂ ناچیز عرض کرے کہ صبح سے والدہ حضرت کی حالت غیر ہے۔ سارا گھر اداس ہے۔ ہم نے نوالا نہیں توڑا۔ والدہ حضرت کو خفقان ہوا ہے اور رہ رہ کر ٹاپوں کی آواز یاد آتی ہے۔ اے پدر بزرگوار، یہ کیا اسرار الٰہی ہے۔ ٹاپوں کی یہ کیسی آواز کانوں میں آتی ہے اور ہم سے کیا کہتی ہے۔"

حکایت مرکب بے راکب کی

حضرت والد صاحب نے تامل کیا۔ پھر شمشیر کو غلاف سے نکال سامنے رکھا اور گویا ہوئے "اے فرزند اب ضرور آپڑا ہے کہ حال اس صاحب اعجاز سواری کا تجھ سے کہوں اور ٹاپوں کی آواز کی رمز کھول کر بیان کروں۔ اے فرزند دلبند جب جہاد کی راہ ثواب طے ہو چکی اور خنجر قاتل کا گلوئے مبارک پر پھر چکا تو اس باوفا نے اپنے گردوں وقار راکب کے پاک لہو میں منھ ملا اور خیمے پر جا کر غم آلود آواز میں ہنہنایا۔ عالم کی شہزادی بے تابانہ در خیمہ پر آئی اور مرکب کو بے راکب پایا اور خون اس کے منھ پہ ملا دیکھا تو فرط الم سے زلفیں کھول دیں اور ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ دیں۔ پھر اسے اپنے والی کی

وصیت یاد آئی اور سیہ پوش ہو منھ پہ نقاب ڈال نوحہ بلب اس مرکب پہ سوار ہو گئی۔ وہ مرکب وہاں سے چلا اور جنگلوں میں نکل گیا۔ راویوں نے قیاس کے گھوڑے بہت دوڑائے ہیں اور مورخوں کا رہوار قلم بہت رواں ہوا ہے پر اس مرکب کی راہ اور سفر اب تک ایک راز سربستہ ہے۔

اے جان پدر اس مرکب کی راہ منزل کا سراغ اب کیونکر ملے اور ان سموں کی تحریر اب کس طور پر پڑھی جائے کہ وہ جنگل کٹ گئے۔ وہ میدان بستیوں سے پٹ گئے اور سموں کی تحریر مٹ گئی۔ اس انقلاب پر حیرانی کیوں ہو کہ زمانے کا طور یہی ہے۔ جنگل کٹتے ہیں شہر بستے ہیں۔ شہر اجڑتے ہیں۔ جنگل بستے ہیں۔ جو بستیاں ویران ہو گئیں انھیں سب روتے ہیں مگر عزیزو ان جنگلوں کو بھی تو یاد کرو جنہیں بستیوں نے ویران کر دیا۔ اس قطعہ ارض کے وہ بلند و بالا شجر کہ ہر شجر ایک شہر ہر پتا ایک کوچہ اور ہر کلی ایک گلی تھی کہاں گئے۔ اے جان پدر میرے پدر نے کہ اپنے وقت کا بڑا بزرگ اور غیب دان عالم تھا مجھے خبر دی تھی کہ ہمارے شہر سے دور کالے کوسوں ایک گھنی بنی ہے، عجائب مخلوقات کی چھاؤنی ہے۔ حد نظر تک درخت، ہر درخت ایک شخصیت، ہر شاخ ایک ذات ان شخصیتوں میں ایک شخصیت سب سے الگ ہے۔ ایک بلند و بالا شجر انبہ۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسے کس نے لگایا اور کس نے پانی دیا جب جرنیلی سڑک نہیں بنی تھی اور شیر شاہ سوری نے اشجار کو فرمانبردار نہیں کیا تھا تب سے وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہے اور آسمان کے بدلتے رنگ اور زمین کے بگڑتے ڈھنگ دیکھتا ہے۔ یہ درخت ماضی اور مستقبل کے ڈانڈے ملاتا ہے اور جنوب کو شمال سے جوڑتا ہے۔

اشہب قلم عرصہ اوراق تاریخ میں یوں رواں ہوا ہے اور راویوں نے یوں رقم کیا کہ جب حیدر علی مسافر صحرائے اندوہ حرماں ہوا تھا اور بے توشہ و زاد راہ یکہ و تنہا پا پیادہ جنگل جنگل خاک چھانتا پھرتا تھا تو ایک روز اسی سفر بے منزل میں اس کا گزر ایک

نواح دلکشا میں ہوا۔ دیکھا ایک چشمہ مانند چشمہ حیواں بہتا ہے۔ کنارے پہ سبزے نے رنگ جمایا ہے۔ درختوں کا سایہ ہے۔ ٹھنڈی ہوا چلتی ہے پھولوں کی خوشبو اڑتی ہے۔ حیدر علی نے کہ کئی روز وں کا تھکا ماندہ اور بھوکا پیاسا تھا آب خنک کو آب حیات اور شیریں پھلوں کو جنت کا میوہ جانا۔ کچے پکے پھل توڑ کر کھائے، پانی پیا، منھ ہاتھ دھویا اور پاس ہی ایک آم کے پیڑ کے نیچے پڑا رہا۔ از بسکہ کئی دنوں کا تھکا اور کئی راتوں کا جاگا تھا لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ وہ نیند عجب تھی کہ پیام بیداری لائی۔ خواب کیا کہ ایک سبز پوش سوار ہے، ہاتھ میں شمشیر آبدار چہرے پہ نقاب۔ ہر چند کہ نقاب پڑا ہے، چہرے کا نور جھلکتا ہے، جلال ٹپکتا ہے فرماتے ہیں کہ حیدر علی اٹھ گھوڑا تیار ہے۔ نادعلی پڑھ۔ ہڑبڑا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ قریب ہری ہری دوب پر ایک دھوپ سا گھوڑا ابڑے تجمل سے چرتا پھرتا ہے۔ رنگ سفید براق، بالا قد، بلند گردن، گول گول سم، ایال پری کے بال، دم رو پہلی چنور، پارا سی تڑپتی رانیں، پھڑکتے نتھنے، دھوپ سی چمکتی جلد۔ حیدر علی نے خواب کو بشارت جانا۔ بڑھ کر گھوڑے کو پکڑا، نادعلی پڑھ کر ننگی پیٹھ پہ سوار ہو گھوڑے کو چمکارا۔ چمکار نے قمچی کا اثر کیا۔ رہوار صبا رفتار نے پھریری لی۔ سوار کی رانوں کے درمیان تڑپا، اور سبزے کو روندتا پھولوں کو پھاندتا تیر کی طرح چلا کہ طرارے بھرنے لگا۔

کہتے ہیں کہ حیدر علی نے عمر بھر اسی گھوڑے پہ سواری کی اور میدان پہ میدان مارے اور سلطنت خدا داد کی بنیاد ڈالی۔ مرتے وقت بیٹے کو وصیت کی کہ فرزند دلبند، ہمارا وقت آخر ہوا۔ ہم سفر کرتے ہیں۔ سلطنت خدا داد تمھارے حوالے۔ اسے پھیلاؤ جنوب کو شمال سے اور اس کماری کو ہمالہ سے ملاؤ۔ ہم نے سب رموز مملکت تمھیں سمجھائے اور خزائن سلطنت تمھارے سپرد کیے۔ ان خزانوں میں سب سے بڑا خزانہ اور سب سے قیمتی امانت ہمارے اسپ وفادار صبا رفتار کو جاننا اور رموز مملکت میں سب سے گہری رمز سمجھنا کہ وہ سلطنت خدا داد کے لیے مانند گاؤ زمین کے ہے۔ وہ بگڑا تو سمجھو کہ

سارا کھیل بگڑا اور سلطنت خداداد تمام ہوئی۔ جب کبھی از خود ہنہنائے تو جاننا کہ کوئی بڑا خطرہ سر پہ آیا، نادعلی پڑھنا اور سوار ہو کر میدان کو کوچ کرنا کہ انشاء اللہ نصرت کو ہم کاب پاؤ گے اور ظفریاب پھرو گے۔

حضرت ٹیپو سلطان شہید نے اس اسپ وفادار اور رہوار پر تمکین و وقار کو اپنی جان سے عزیز جانا اور ہر معرکہ اس کی پشت پر لڑا اور میدان مارا۔ آخری معرکہ میں عجب گزری کہ حافظہ کی ذرا سی خطا سے نشانہ خطا ہوا۔ روایت ہے کہ وہ وقت زوال کا تھا۔ لوں چلتی تھی، گرمی پڑتی تھی۔ آم کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں دسترخوان بچھا تھا۔ اے پسر، حضرت ٹیپو سلطان کو آم بہت مرغوب تھے اور آم کے پیڑوں کی چھاؤں بہت محبوب تھی۔ قلعہ کے باغ میں بہت آم تھا۔ قلمرو ہند کے ہر قطعہ ہر زمین سے قلم منگوائی گئی تھی اور اس بوقلموں باغ میں آراستہ کی گئی تھی۔ مئی دو روز ہوئے لگی تھی۔ امیوں میں جالی پڑ گئی تھی۔ اے پسر، آموں کی فصل اس برس مندی ہوئی تھی۔ آندھیاں مستزاد کہ اس برس بہت چلیں اور آموں کے پیڑوں کی بھری گودیں خالی کر دیں۔ پر اس باغ کے پیڑوں کی بہت سی شاخیں ابھی امیوں کے بوجھ سے جھکی تھیں اور کچی امیوں کی مہک سے بسی گھنی چھاؤں میں دسترخوان بچھا تھا۔ انواع و الوان کا کھانا اس پہ چنا تھا، امراو وزراء و حضار قطار در قطار بیٹھے تھے اور درمیان ان کے حضرت سلطان تشریف فرما تھے۔ طعام تناول کیا چاہتے تھے کہ اصطبل سے اسپ وفادار کے ہنہنانے کی آواز کان میں آئی۔ حضرت رک گئے۔ تامل کیا پھر نوالہ توڑا۔ لقمہ قاب میں تھا کہ ایک بڑا سا ہرا ہرا پتا ڈال سے ٹوٹ کر قاب میں یوں گرا جیسے تیوراتے سپاہی کی ڈھال زمین پر گرتی ہے۔ لقمہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اس آسماں وقار نے کمال وقار و تحمل سے نظر اٹھا درخت کی طرف دیکھا۔ ابھی درخت کو دیکھتے تھے کہ اسپ وفادار پھر ہنہنایا اس تندی سے کہ سارا قلعہ گونج گیا اور ٹاپوں سے زمین ہل گئی۔ مڑ کر نظر کی، دیکھا کہ اسپ وفادار اصطبل سے رسا

تڑا نکل آیا ہے اور اسی نظر میں دیکھا کہ خبر رساں مورچے کی سمت سے دوڑتا آتا ہے۔ سراسیمہ، باحال پریشاں مودب صدا دی "سلطان کا اقبال بلند ہو۔ غفار وفادار مارا گیا۔ فوج فرنگ فصیل پر چڑھ آئی۔"

وہ فلک جناب یہ خبر سن جلال میں اٹھ کھڑا ہوا۔ فرمایا گھوڑا کسو۔ ہماری جنگ کا ہنگام آ گیا۔ پھر امراء و وزراء کو اس غضب سے دیکھا کہ ان کے چہروں کے رنگ فق ہو گئے۔ غیظ میں شمشیر نیام سے نکالی اور نیام کو توڑ ڈالا اور قدم رکاب میں رکھا۔ عجب ہوا کہ سلطان نے جلال اور عجلت میں نادعلی کا ورد بھولا۔ اب گھوڑے کو ایڑ دیتے ہیں تو وہ ایڑیاں گھستا ہے۔ دولتیاں مارتا ہے پر آگے نہیں بڑھتا۔ سلطان کو اس وقت عجب ہراس ہوا سوئے فلک نگاہ کی، پھر گھوڑے پر نظر کی اور گویا ہوئے کہ "اے اسپ وفادار، میرے ہمدم، میرے اخی، کیا تیرا جذبہ وفا بھی سرد ہوا چاہتا ہے۔" اس فقرے نے اثر دکھایا۔ گھوڑے نے زمین پہ ٹاپیں ماریں اور تیر کی طرف زن سے فصیل کی سمت چلا۔ پر اسپ وفادار کی وفا سے تلافی نہ ہو سکی۔ سلطان جب گھوڑے سے زمین پہ تشریف لائے اس دم انھیں اپنی بھول کا خیال آیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اے پسر عزیز، نگارندگان تاریخ کا اشہب قلم سلطان کی شہادت کے تذکرے میں خوب جولانی دکھاتا ہے، پر ان کے گھوڑے کے ذکر پر ٹھٹھک جاتا ہے مگر رہوار تخیل کو کس نے باگ دی ہے اور دل و دماغ میں اتری ہوئی تصویر کو کس نے مٹایا ہے۔ بزرگوں سے یہ روایت سینہ بسینہ چلی آتی ہے اور سچائی کی آنچ بن کر سینوں میں دہکتی ہے کہ جب سلطان مرتبہ شہادت پر فائز ہو چکے تھے تو اسپ وفادار نے خون مبارک میں اپنا منہ ملا اور شہادت گاہ سے نکل گیا۔ خدنگ آخریں سے نکلا ہوا یہ شرارہ مقتل سے جنگلوں کی سمت نکل گیا اور شعلہ جوالہ بن کر بھڑکنے لگا۔

سانحہ یہ ہوا کہ ایک غدار وزیر نے گھوڑے کو مقتل سے نکلتے دیکھ لیا۔ ازبسکہ وہ اس

گھوڑے کے اعجاز سے واقف تھا، فرنگی آقاؤں کو خبر پہنچائی کہ غضب ہوا سلطان کا گھوڑا نکل گیا۔ ٹیپو کی شہادت کی خبر اب آگ بنے گی اور بستی بستی پھیلے گی جس جوانمرد نے جرأت دکھائی اور گھوڑے کی پشت پہ بیٹھا وہ ٹیپو بنے گا۔ اے جانِ پدر یہ اس معرکہ میں آخری سازش تھی۔ میں نے اپنے پدر سے اور میرے پدر نے وقت کے ثقہ راویوں سے سنا ہے کہ رخ اسپ وفادار کا درۂ خیبر کی سمت تھا۔ جب وہ درۂ خیبر پہنچتا تو جنوب سے شمال تک اور مغرب سے مشرق تک ہنگامہ بپا ہوتا۔ پر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

فوج فرنگ تعاقب میں تھی اور فرس صبا رفتار فراٹے بھرتا تھا۔ فاصلے گرد کی مانند اڑے جاتے تھے۔ ٹاپوں کی دھمک سماتا سمک پہنچتی تھی۔ اس تگ و دو میں لہلہاتی کھیتیاں بہت پامال ہوئیں اور بہت جنگل روندے گئے۔ اس صبا قدم رہوار کی خوب چم خم تھی کہ گاہ پری کی مثال اپنا جمال دکھاتا اور یہ نفاست سے چلتا کہ راہ میں پڑا بتاشا اور سموں میں آیا انڈا نہ پھوٹتا، گاہ یہ سرپٹ دوڑتا کہ چٹانوں سے چنگاریاں اڑتیں اور سمندروں کا پانی اچھل جاتا۔

یہ آوارۂ دشت غربت جب دوڑتے دوڑتے قریب اس بستی کے اس مقام پر آیا اور اس جنگل سے گزرا تو درمیان میں آم کا ایک گھنا پیڑ آیا۔ اس پیڑ کی مہک عجب تھی کہ گھوڑا ٹھٹھک گیا۔ اے جان پدر جانا جاتا ہے کہ جس درخت کے سائے میں سلطان نے آخری لقمہ توڑا وہ اسی بزرگ درخت کی قلم تھی۔ سائے میں اس کے گھوڑے نے دم لیا۔ ایک فرنگی بندوقچی غضب کا نشانچی گھات میں تھا۔ اس نے نشانہ باندھا اور طمنچہ چلا دیا۔

جب فوج اعدا قریب آئی تو دیکھا کہ پیڑ کے نیچے تازہ خون پڑا ہے، پر گھوڑا غائب ہے جنگل کو تلپٹ کر ڈالا، میدان سارا چھان مارا، کہیں سراغ اس کا نہ ملا۔ گھوڑا تب سے غائب ہے۔ اللہ عالم حاضر و غائب ہے۔ کائنات کارخانہ عجائب ہے۔ یہاں کی ہر شے

عجیب ہر واقعہ غریب۔ دیکھی چیزیں ان دیکھی بن جاتی ہیں۔ حقیقتیں افسانوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ میرے پدر نے مجھے خبر دی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ مرکب کہ مچل آوارہ خوشبو اور بے قرار روح کے جنگلوں میں بھٹکتا ہے اس شہر کی راہ سے گزرے گا۔ تب اس کی ٹاپوں کی آواز شہر پر محیط ہو گی اور بہت بڑا رن پڑے گا۔ نو نیزے پانی چڑھے گا۔

پدر بزرگوار خاموش ہو گئے۔ میں دیر گھٹنے پہ ٹھوڑی رکھے ساکت بیٹھا رہا اور خیالات میں غلطاں رہا۔ پھر میں نے جھرجھری لی اور عرض کہ اے پدر بزرگوار آپ نے ٹیپو سلطان کی حکایت سنائی پر یہ نہ بتایا کہ وہ مثل خوشبو کیوں آوارہ اور بے قرار پھرتا ہے۔

پدر بزرگوار نے فرمایا "اے جانِ پدر اس مرکب کی پشت اپنے راکب کو پکارتی ہے جب وہ راکب پیدا ہو گا اور اس پر سوار ہو رَن میں جائے گا، تب اس پاکیزہ روح کو قرار آئے گا۔"

میں نے عرض کی کہ "اے پدر اس تک رسائی کا کیا طریق اور اس کی سواری کی کیا شرط ہے۔"

پدر نے جواب دیا "اے پسر میں نے اپنے پدر سے سنا ہے کہ جو مہم باز قسمت آزما اس جنگل کا پتہ لگائے گا اور اس بزرگ درخت تک پہنچے گا وہ اس مرکب کو اس کے گھنے سائے میں کاٹھی رکاب سے درست جھرجھری لیتا ہنہناتا پائے گا۔"

میں نے استفسار کیا "اس جنگل تک پہنچنے کا کیا طریقہ اور اس درخت کو پانے کا کیا وسیلہ ہے؟"

فرمایا "جان پدر، یہ جنگل انسانی نظر سے گم ہے۔ صرف طیور اس کا نشان جانتے ہیں اور اس درخت کی شاخ پر بیٹھا طائر ہر آفت ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے۔ طوطیاں خوش الحان کہ تعلق قدیم آم کے پیڑ سے رکھتے ہیں پہلے اس درخت کا طواف کرتے ہیں، تب

دوسرے درختوں پر اترتے ہیں۔ میرے پدر نے مجھے خبر دی ہے کہ جو قسمت آزما اپنے حوصلہ کو سہارا اور طوطی خوش لحن کو رہنما بنائے گا منزل پہ پہنچے گا۔ مرکب کار اکب بن کر گمشدہ منزلوں کا سراغ پائے گا اور فتح کا ڈنکا بجائے گا۔"

صاحبو اس حکایت غریب نے مجھ پر یہ اثر کیا کہ نیند رات کی آنکھوں سے رخصت ہوئی۔ وہ رات بے آرامی میں کٹی۔ کئی مرتبہ آنکھ لگی اور آپ ہی آپ کھل گئی۔ جب بھی آنکھ کھلی دیکھا کہ نماز کی چوکی پر شمعدان روشن ہے۔ مناجات کی کتاب سامنے کھلی ہے۔ والدہ حضرت مثل بید کانپتی ہیں اور رقت بھری آواز میں ورد کرتی ہیں۔ یا علی یا ایلیا یا ابوالحسن یا بوتراب اور والد بیچ صحن میں عصا ٹیکے کھڑے ہیں اور دمبدم بدلتے آسمان کو تکتے ہیں۔ آج وہ پھر حجرے سے باہر نکل آئے تھے۔ والدہ حضرت کی رقت بھری آواز یا علی یا ایلیا یا ابوالحسن یا بوتراب عجب تھی۔ نیند اس آواز سے کئی بار اچٹی۔ پھر وہی آواز غنودگی بن گئی۔

صبح کے ہون میں آنکھ لگی تھی کہ کسی نے بازو پکڑ کر ہلایا۔ آنکھ کھولی تو دیکھا والد ماجد سرہانے کھڑے ہیں اور بازو ہلا کر فرماتے ہیں "بیٹا اٹھو صبح کا تارہ چمکتا ہے۔ اذان ہوتی ہے۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ دیکھا کہ والد نے سر پر سفید عمامہ باندھ رکھا ہے۔ دوش پہ قبا پڑی ہے۔ کمر میں سبز پٹکا بندھا ہے۔ بڑھ کر مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ میں نے محسوس کیا کہ جسم مبارک سر سے پیر تک کانپتا ہے اور آواز میں رقت کی ہلکی کیفیت ہے۔ فرمانے لگے "بیٹا ہم فریضہ سحری ادا کرنے جاتے ہیں گھر سے خبردار رہنا۔"

میں کچھ نہ سمجھا۔ سکتہ کے عالم میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ وہ جناب جب چلنے لگے تب ہوش آیا اور جب ہوش آیا اور جھرجھری لی تو وہ قدم باہر نکل چکے تھے۔ دروازے کی

کنڈی کھلی اور پھر کنڈی کھلنے اور دروازہ بند ہونے کی آواز گلی میں گونجتی ٹاپوں کی آواز میں گم ہوگئی۔

میں حیران بستر سے اٹھا۔ سیدھا والد ماجد کے حجرے کی سمت چلا۔ حجرہ کھولا، دیکھا کہ شمشیر جو شب بھر برہنہ جناب کے روبرو رکھی رہی تھی غائب ہے۔ میں حجرے سے نکل سیدھا زینے پر چڑھ گیا۔ آسمان کی سیاہی ڈھل چلی تھی۔ تاروں کا قافلہ بکھر گیا تھا کوئی کوئی ستارہ آوارہ آوارہ دشت فلک میں بھٹکتا تھا۔ اونچی چھتیں اور مینار اور گنبد ابھی تک سیاہی میں غرق تھے۔ ان چھتوں اور میناروں سے پیچھے کہیں دور توپیں گرج رہی تھیں اور آسمان کا کنارہ سرخ سرخ لگتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بالا قد مرکب بے راکب کا تصور آنکھوں میں بندھنے لگا اور ٹاپوں کی آواز خون کی دھار بن کر رگوں میں گرجنے لگی۔ میرا جسم دہکنے لگا۔ ایک جنون کے عالم میں نیچے اترا۔ والدہ حضرت پر نظر کی کہ آرام میں ہیں۔ نماز کی چوکی پر جانماز بچھی ہے مگر کونہ اس کا الٹا ہوا ہے اور شمعدان بجھا پڑا ہے۔ صحن میں ابھی اندھیرا تھا۔ بس دیواروں کے اوپری حصے اور منڈیریں اجل گئی تھیں۔ صحن خاموش تھا۔ ہاں کبوتروں کی کابکوں کے اندر پنجبنیوں کا زمزمہ گونجتا تھا اور گٹکنے کی آوازیں مثل جوئے طباشیر کابک کے پردوں کو توڑ کر فضا میں بہہ رہی تھیں۔ میں نے اس صحن کو، ان زمزموں سے لبریز کابکوں کو، والدہ حضرت کو کہ ہنوز آرام میں تھیں ایک نظر دیکھا اور بے تابانہ دروازہ کھول باہر نکل گیا۔

دوستو مہینہ وہ مارچ کا تھا۔ ماہ مارچ کوچ کرتا تھا اور راتیں چھوٹی، دن لمبے ہوتے جاتے تھے۔ آموں کی ٹہنیاں مول کے شیریں بوجھ سے جھک گئی تھیں اور بھونرے مول کے گچھوں پر ہر آن منڈلاتے تھے۔ اب تڑکا تھا اور ایک شاما چڑیا دھندلکے میں غرق منڈیروں پہ آزادانہ پھدکتی پھرتی تھی۔ ہوا کم کم چلتی تھی۔ مول کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں تیرتی تھی۔ بازار ابھی بند تھے اور گلیوں میں آمد و رفت شروع نہیں

ہوئی تھی۔ کہیں دور سے توپ کے گرجنے کی آواز بدستور آئے جاتی تھی۔

میں دیر گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا۔ دن اب چڑھ رہا تھا۔ پر بازار اسی طرح بند تھے۔ گلزار محلے بیابان، خوشبو راہیں ویران، دریچے بند، دروازے مقفل، چوک جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور تڑکے سے رات گئے تک کٹورا بجتا تھا سنسان تھا۔ سارا شہر بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ میں اکیلا چلا جاتا تھا اور اپنی آہٹ پہ آپ چونکتا تھا۔ ناگاہ دور ایک سمت سے علم سبز ایک لچکتا ہوا نمودار ہوا۔ علم کی ضو سے آنکھ جھپک گئی۔ علم کے بعد علم دار پہ نظر گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ناقہ پہ سوار ایک مرد غازی چلا آتا ہے۔ ایک ہاتھ میں علم سبز دوسرے میں نیزہ علم کیے ہوئے۔ بازو غلاف سے اگلی شمشیروں کی طرح آستینوں سے ابلے ہوئے، سر پہ سفید عمامہ، دوش پہ سبز عبا منھ پہ سیاہ نقاب۔ یکا یک ناقہ تھم گیا۔ ناقہ سوار نے علم کو بلند کیا اور نیزے کو جنبش دی۔ پھر ایسی گرجدار آواز میں نعرہ مارا کہ در و دیوار ہل گئے اور پکارا کہ "اے گروہ مردم خبر دار ہو کہ ایک بڑا سیلاب تمھارے خراب آباد پہ امنڈا ہے اور محلات و مساجد و مقام ہر کو بسان خس بہا لے جانا چاہتا ہے۔ اے لوگو خدا کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی۔ آسمانوں کے برجوں میں ظلمت چھا گئی۔ آفتاب پہ کالک پت گئی۔ دن میں شب کی سیاہی کا سماں پیدا ہوا۔ اے لوگو آج نقد جاں کی قیمت گر گئی اور موت کی قیمت چڑھ گئی۔ بخدا آج زندگی بکری کی چھینک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور موت شیر مادر سے زیادہ شیریں ہو گئی۔ خبر دار ہو اے لوگو کہ تم پر بہت بڑی آزمائش کا وقت آیا ہے۔ رن بولتا ہے اور تمھارے مرکبوں کو پکارتا ہے۔ تمھارے مرکب تھانوں پہ کھڑے تڑپتے ہیں اور ان کی پشتیں راکبوں کے لیے بے کل ہوتی ہیں۔

اس خطبہ کا عجب اثر دیکھا کہ سنسان راہیں قدموں کے شور سے گونجنے لگیں اور اندر سے بند دروازے دھاڑ دھاڑ کھلنے لگے۔ جوانان صف شکن لمبے تڑنگے، سروں پہ عمامے

رکھے، کمر سے ٹپکے باندھے، ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے، کوئی پا پیادہ کوئی گھوڑے پہ سوار گلی گلی سے نکلتے دکھائی دیے۔ دیکھتے دیکھتے ایک لشکر آراستہ ہوگیا۔ تب اس سبز پوش ناقہ سوار نے ایک جڑاؤ خنجر موتیوں کا آوازہ لگا ہوا کمر سے نکال میرے آگے پھینکا اور نعرہ مارتا ہوا آگے بڑھ لیا۔ وہ پورا لشکر نعرہ زناں اس کے پیچھے چلا۔

دم کے دم میں وہ علم سبز، وہ ناقہ سوار، وہ لشکر سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور بازار بھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

میں سکتہ کے عالم میں کھڑا تھا اور سوچتا تھا کہ یارب یہ آناً فاناً کیا خواب سا آیا اور چلا گیا پھر ڈرتے ڈرتے میں نے وہ خنجر اٹھایا کہ اس کے اٹھاتے ہی رگوں میں خون گرجنے لگا اور کانوں میں مرکب بے راکب کی ٹاپوں کی آواز گونجنے لگی۔ میں نے وہ جڑاؤ خنجر کمر میں لگایا اور گھر کی طرف چلا۔ اسی خواب کی چکا چوند آنکھوں میں سمائی تھی اور رگوں میں خون گرجتا تھا اور کانوں میں ٹاپوں کی آواز دم بدم گونجتی تھی۔ میں یہ سوچتا جاتا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ گھر چل کر مرنے کی رخصت لیں اور رن کی طرف چلیں۔

جب میں اپنی گلی میں مڑا تو نرالا عالم دیکھا۔ سموں کے تازہ تازہ بہت سے نشان گویا اس راہ سے کوئی لشکر گزرا ہے۔ جا بجا شکستہ دروازے، جالیاں ویران، دریچے سنسان۔ میں حیران کہ دم کے دم میں یہ کیا ماجرا گزرا۔ ناگاہ کان میں ایک سراسیمہ طوطے کی آواز پڑی۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ننھا لاشہ خاک و خون میں غلطاں پڑا ہے۔ گلاب رخسار کمہلائے ہوئے لبوں کی پنکھڑیاں مسلی ہوئی، کاجل آنکھوں کا اِدھر اُدھر پھیلا ہوا۔ جھنڈولے بالوں کے ہالے میں ماتھا خاک سے اٹا ہوا۔ گلے میں ہنسلی، پھول بدن میں شبنمی کرتا بھنچی ہوئی مٹھی میں پنجرا طوطا سراسیمہ بری طرح چلاتا ہے اور پنجرے میں پھڑکتا ہے۔ گویا اپنے ننھے مالک کا حال جانتا ہے۔ اے عزیزان گرامی یہ ستارہ ایسا لاشہ اسی مہ لقا کے کمسن برادر کا تھا جس کی صورت ہماری فضائے قلب میں ستارہ

بن کر چمکتی تھی۔ میں سمجھا کہ مقرر اس گھر پر کوئی بلائے ناگہانی ٹوٹی۔ میں نے پنجرے کی کھڑکی کھولی کہ کھلتے ہی اس کے وہ طائر مثل طائر روح کے اس قفس سے پرواز کر گیا۔

پھر میں قدم مارتا حویلی پہ پہنچا۔ ڈیوڑھی خالی پڑی تھی، پھاٹک چوپٹ کھلا تھا۔ مطب بند تھا مگر پھر بھی مجھے باور نہ آیا اور قبلہ حکیم صاحب، قبلہ حکیم صاحب کر کے بہت پکارا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اونچی کنگنی سے جنگلی کبوتروں کا ایک جوڑا پھڑ پھڑا کر نکلا اور پھٹپھٹاتا اڑ گیا۔ خانۂ دولت خالی پڑا تھا۔ اندر باہر بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ میری پکار اس بلند مقف و بام میں بار بار یوں گونجی گویا کوئی دوسرے عالم سے پکار کا جواب پکار سے دیتا ہے۔ میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور ڈیوڑھی سے ہٹ کر گھر کی طرف ہولیا۔

گھر پہنچا تو یہاں بھی ویرانہ پایا۔ اندر باہر بہت ٹٹولا۔ بہت آوازیں دیں کوئی جواب نہ ملا۔ حجرہ بدستور بند تھا اور والدہ حضرت کی نماز کی چوکی پر جانماز بچھی تھی۔ سجدہ گاہ قرینے سے سجی رکھی تھی اور مناجات کی کتاب کھلی رکھی تھی گویا علی یا ایلیا یا ابوالحسن یا بوتراب پڑھتے پڑھتے اٹھی ہیں اور چلی گئی ہیں۔ گھر دالان اور کمرے اور صحن سب سنسان۔ بس کابکوں کے اندر ایک اضطراب برپا تھا۔ دوپہر ہوگئی تھی اور کبورا ابھی تک نہیں کھلے تھے۔ میں نے بڑھ کر کابکیں کھولیں اور کبوتر اندر سے اس اضطراب سے نکلے گویا قیدی خانۂ زنداں سے نکلتے ہیں۔ دانہ ڈالا ناندوں میں پانی بھرا اور پھر کبوتروں سے بھرے صحن پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔

گلی میں قدم رکھا تھا کہ ٹاپوں کا شور کان میں آیا۔ میں تیر کی طرح چلا۔ ایک ڈیوڑھی میں چھپ گیا۔ گھم گھم ایک گھڑسوار رسالہ گلی میں داخل ہوا اور بھنگم خروش کرتا دوسری راہ نکل گیا۔ میں ڈیوڑھی سے باہر آیا تو ایک سوار سے دوچار ہوا کہ ذری پیچھے رہ گیا تھا۔ میں نے نام مولا علی کا لیا اور کمر سے خنجر نکال پھینک کر مارا کہ اس کی چھاتی میں جا کر چھد گیا اور وہ تیورا کھر گھوڑے سے گر پڑا۔ میں جھٹ پٹ اس کے اسلحہ اتار اپنے

زیب تن کیے اور گھوڑے پہ سوار ہو کر ایڑ دی۔

چلتے چلتے میں نے گلی کے در و دیوار پہ حسرت سے نظر کی اور مڑ کر اپنے گھر اور اس حویلی کو دیکھا۔ وہ بام بلند بہت اجاڑ نظر آئی ہے۔ اپنی چھت پر کیا دیکھا کہ کلسری اکیلی چھتری پہ بیٹھی ہے۔ ٹکڑی اک چھت سے اٹھ کر ہوا میں بکھر گئی ہے۔ گم کردہ راہ قافلہ کی طرح آسمانی راہوں میں بھٹک گئی ہے۔ اتنے میں گھوڑا اپنی گلی سے نکل دوسری راہ مڑ گیا۔ وہ لمبی گلی، وہ در و دیوار، وہ بام بلند، وہ اپنے کوٹھے کی اونچی چھتری سارا سماں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

میں گلی سے نکل بازار خاص کی طرف چلا۔ بیچوں بیچ سڑک کے، کتا ایک بیٹھا اونگھتا تھا۔ میرے گھوڑے کی ٹاپوں پر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، بے دلی سے اٹھا اور سڑک کے کنارے ہو ایک گلی میں مڑ لیا۔ آگے کوؤں کی ایک ٹکڑی سڑک کے وسط میں مٹر گشتیاں کرتی تھی۔ گھوڑے کو سر پر دیکھ کر وہ آہستہ سے اڑی اور ٹاپوں کی زد سے ہٹ کر پھر سڑک پہ اتر پڑی۔ بندوقوں کی آواز کبھی دور سے کبھی قریب سے سنائی دیتی۔ بہت شور کی آواز کان میں آتی، پھر سناٹا چھا جاتا۔ دفعتاً سڑک کے آخری کنارے پہ گرد اٹھتی دکھائی دی۔ ٹاپوں کا شور گونجتا، گرد چھٹتی، کوئی اکیلا سوار سرپٹ دوڑتا آتا، پاس سے تیر کی طرح گزر جاتا اور پھر سڑک بھائیں بھائیں کرنے لگتی۔ دریچے اک ذرا کھلتے، جالیوں کے پیچھے سہمی ہوئی آنکھیں پریشان صورتیں ایک جھلک دکھاتیں اور اوجھل ہو جاتیں۔

بازار خاص سے نکل میں چھوٹی درگاہ پہنچا۔ گھوڑے کو باہر باندھا، جوتیاں سیڑھیوں پہ اتاریں اور بصد احترام اندر داخل ہوا۔ صحن میں قدم رکھا تھا کہ سنگ مرمر کے حوض پہ نظر جا ٹکی۔ ایک عزیب ہستی، سراسر تجلی، صبر و تحمل کا پیکر، کنار حوض تشریف فرما ہے اور وضو میں مصروف ہے۔ دفعتاً ٹاپوں کے شور سے صحن گونج گیا اور ایک بلند قد کشادہ بدن سوار

ظاہر ہوا۔ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ،دوسرا ہاتھ گھوڑے کی پشت پر۔ ہاتھ حوض میں ڈالا چلو بھرا فرمایا"الٹ دوں۔"اس نورانی صورت نے کمال تحمل اور سکون سے اس کی طرف دیکھا۔فرمایا"نہیں۔"سوار نے چلو کو کہ مثل سمندر جوش کھاتا تھا،آہستہ سے حوض میں خالی کر دیا۔پھر ٹاپوں کے شور سے ساری درگاہ گونج گئی اور وفور تجلی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔دوسری گھڑی نہ وہ نورانی صورت تھی نہ سوار تھا،مرمریں حوض مثل چشم پر آب چھلکتا تھا۔

اس معجزے کی چکاچوند آنکھوں میں لئے،عقیدت کا ایک سمندر سینے میں سنبھالے،الٹے پاؤں وہاں سے واپس ہوا۔رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے کو ایڑ دی۔گلی کوچے اسی طرح ہوحق کرتے ہوئے،بازاروں کے مرقعے بکھرے ہوئے۔ایک کوچے میں سراسیمگی کو سوا پایا۔دکانیں بہت سی بند ہیں جو بند نہیں ہوئی ہیں ان میں اشیائے قیمتی سجی ہیں۔پر نہ دکاندار نہ خریدار۔خونچے اٹھتے ہیں،پھیری والے راہ سے ٹلتے ہیں۔اہل محلہ گھروں میں بند ہوتے ہیں یا یوں نکلتے ہیں گویا بھونچال میں گھر چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔اونچے دروازے ماہی نشان پھاٹک دھاڑ دھاڑ کھلتے ہیں بند ہوتے ہیں اور نکلنے والے سر سے کفن باندھ کر نیام تلواروں کے توڑ کر باہر نکلتے ہیں اور جمع ہوتے لشکر میں شامل ہوتے ہیں۔اس لشکر میں بہت رنگ دیکھے کسی سر پہ خود رکھا ہے،کسی سر پر عمامہ سجا ہے۔کوئی دو پلوٹوپی پہنے ہے،کوئی ننگے سر نکل آیا ہے۔تلواروں والے تلوار گھماتے ہیں،نیزے والے نیزے ہلاتے ہیں۔بہت سے ایسے ہیں کہ نہ نیزہ نہ تلوار،چارپائی کی پٹی اٹھائے چلے آتے ہیں اور گرز گراں اسے جانتے ہیں۔کسی کسی ہاتھ میں خالی پھنکنی نظر آئی۔کسی نے غلیل اٹھائی،غلے جیبوں میں بھرے اور نکل پڑا۔ناقہ سوار ناقہ پہ کھڑا ہو گیا تھا اور پکارتا تھا کہ"اے گروہ مردم خبردار ہو کہ سیلاب تم پر امنڈ آیا۔رن بولتا ہے اور تمہارے مرکبوں کو پکارتا ہے۔تمہارے مرکب تھانوں پر کھڑے تڑپتے ہیں۔

ان کی پشتیں اپنے راکبوں کے لیے بے کل ہوتی ہیں۔"

ان کلمات سے وہ تاؤ کھاتا لشکر ابل پڑا اور مانند ایک بڑے سیلاب کے شور کرتا بہہ نکلا۔ تب میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی اور اس ابلتے شور کرتے سیلاب میں شامل ہوگیا۔

مجمع میں نگاہ چونکی اور سموں اور قدموں سے اٹھتی ہوئی گرد پردہ بن گئی۔ وہ سبز پوش ناقہ سوار نظروں سے اوجھل ہوا۔ سامنے میدان کارزار نظر آیا۔ نقارہ و غار پر چوٹ پڑتی تھی۔ شہپور کی غریو سے آسمان ہلتا تھا۔ قرنا کی مہیب صدا، جھانجھوں کا شور، طبل کی فغاں۔ شیر دلوں کے نعروں سے گھوڑوں کے دوڑنے سے بن کانپتا تھا۔ عربی ترکی عراقی یمنی کاٹھیاواڑی دکھنی قسم قسم کا رہوار جمع تھا۔ باریک جلد، سینہ کشادہ، بلند سر۔ ہاتھی ایک سے ایک زبردست، سونڈیں اور دمیں غضب سے اٹھی ہوئیں۔ توپیں ان پر دھری ہوئیں کہ گولہ ان سے اڑ کر چرخ پہ جاتا تھا اور آسمان میں شگاف ڈالتا تھا۔ ہاتھوں میں ایک ہاتھ بہت سجا بنا نظر آیا۔ سونڈ رنگی ہوئی مستک نقش و نگار سے سجا ہوا، جھولیں زر لفت کی، رسے کلابتوں کے، زنجیریں طلائی، عماری نقرئی، اس نقرئی عماری میں وہ ملکہ بصد وقار تشریف فرما تھی جس کے چہرے کی ضو سے وہ دشت پر آشوب عرش بنا تھا۔ زمین پہ عنبر سارا کا فرش بچھا تھا اور جنگل اس عطرتن کی خوشبو سے مہکتا تھا۔ روبرو طوطا چاندی کے پنجرے میں بند بیٹھا ہوا گرد اس ماہتاب کے ستاروں کا حلقہ گوری گوری صورتوں کا مجمع۔ کوئی مورچھل سے مگس رانی کرتی ہے کوئی پنکھا جھلتی ہے، کسی نے گلاب پاش کھولا اور زخمی غازیوں پر چھڑکا ہے۔ ارد گرد آس پاس سقے کھار دے کی لنگیاں لپیٹے گھومتے ہیں۔ ہر صف میں جاتے ہیں۔ پیاسے مجاہدوں کو شربت پلاتے ہیں، برفاب کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔

عماری پہ بلند ستاروں میں سے ایک ستارے پہ اپنی نظر ٹھٹکی کہ بائیں شہزاد محل کی

دفعتاً گولا ایک ہاتھی کے برابر آ کر گرا۔ غبار اور دھوئیں میں سب کچھ چھپ گیا۔ ہاتھی بگڑا، مورچہ بکھرا، دیکھتے دیکھتے اعدا نے فلک مرتبت سواری کے گرد گھیرا ڈالا۔ میں نے نیام سے شمشیر نکالی اور گھوڑے کو آگے بڑھا سواری کے برابر ہو لیا۔ تھوڑے جاں نثار غازی آگے آئے۔ پھر تو وہ رن پڑا کہ ساری فوج صورت گرداب چکر میں آئی۔ صفیں موجوں کی مثال ایک دوسرے پہ گریں، دریائے خوں نے سیلاب کیا۔ اس ثریا نشان سواری کے گرد بہت خون بہا اور اس شمع پر سے بہ پروانے نثار ہوئے۔ دشمن کو ہم نے قریب پھٹکنے نہ دیا اور اس آرام سے سواری کو رن سے نکال کر لائے کہ کنیزوں کے گورے ہاتھوں میں مورچھلیں اسی طور گردش کرتی رہیں، عطر دان پاندان کھلے رہے کہ نہ کوئی عطر کی شیشی شکست ہوئی نہ کتھے چونے کی کلھیاں خلط ملط ہوئیں اور جناب عالیہ کے دست سیمیں میں نقرئی کٹورا کیوڑے زعفران کے شربت سے لبالب بھرا جوں کا توں رہا کہ قطرہ شربت کا پوشاک مبارک پر نہ ٹپکا۔

رن میں تن بدن کا ہوش کہاں تھا۔ وہاں سے نکلے تو اپنے حال پہ نظر کی۔ بدن زخموں سے چور، لہو میں شرابور دیکھا۔ نقاہت طاری ہونے لگی۔ رکابوں میں قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ ہاتھ سے باگ چھوٹنے لگی۔ نیم غشی کے عالم میں میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے سہارا دیتا ہے پھر ارد گرد کی چیزیں دھندلاتی چلی گئیں۔ ہوش وحواس پہ اک پردہ پڑتا چلا گیا۔

جانے میں کتنی دیر غش رہا۔ جب ہوش آیا تو رات ہوئی تھی۔ جھمکتے شمعدانوں میں مومی شمعیں روشن تھیں، سونے چاندی کی منقلوں میں عنبر وعود جلتے تھے۔ اگر دانوں میں اگربتیاں سلگتی تھیں۔ نقطہ ایسی چنگاریاں بتیوں کی نوکوں پر دہکتی ہوئی، مہکتے دھوئیں کی نیلی سرمئی دھاریاں بل کھاتی ان سے نکلتی ہوئی۔ مجھے لخلخہ سنگھایا اور گلاب منہ پر چھڑکا جا رہا تھا۔ خوشبوئیں رنگا رنگ دماغ میں چڑھی تھیں۔ بدن میں بسی تھیں۔ مگر ان سب سے

بڑھ کر مہک اس عطر تن کی تھی جس کے مخملیں زانو پر سر ہمارا ٹکا تھا۔ لمبی نرم انگلیاں پیشانی کو چھوتی تھیں، پھر بالوں میں سرسرانے لگتی تھیں۔ ان انگلیوں کی گردش نے یہ عمل کیا کہ بیدار ہوتے حواس پہ پھر غنودگی کا پردہ چڑھنے لگا۔ زخموں سے نڈھال جسم کو اس سمے بہت سکھ ملا۔ سارے بدن میں ایک نیند بھری شیریں رو سرسراتی تھی۔ جی چاہا کہ اس میٹھے مخملیں زانو پر سر یونہی ٹکا رہے اور بدن میں وہ نیند بھری شیریں رو اسی طرح سرسراتی رہے، ہوش و آگہی پہ چھا جائے، انھیں بہا کر لے جائے مگر اسی اثنا میں اس نے خادمہ کو پکارا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھا کہ شہزاد محل سرہانے بیٹھی ہے، دست حنائی سے پنکھا جھلتی ہے، گلاب پاش سے بار بار عرق میرے چہرے پر چھڑکتی ہے۔ میں مارے گھبراہٹ کے اٹھا چاہتا تھا کہ اس نے آہستہ سے میرا سر تھاما اور پھر زانو پہ رکھ لیا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ میری آنکھوں میں غیر متوقع وصال کی خوشی اور حیرت کے سوا بھی کچھ سوال تھے۔ اس نے ان سوالوں کا منھ سے کچھ جواب نہ دیا۔ بس اس کی آنکھ بھر آئی۔ میں اس مغموم چہرے اور بھری آنکھ کی تاب نہ لا سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عجیب وسوسے اور واہمے دل و دماغ میں منڈلانے لگے۔

"تمھارے والد صاحب۔۔۔" وہ رک گئی۔ بولنے سے پہلے ہی اس کی آواز رندھنے لگی تھی۔ اس نے توقف کیا، پھر سنبھلی ہوئی آواز میں بولی "تمھارے والد حضرت صبح کی نماز کے لیے ایسے گھر سے نکلے کہ پھر گھر نہیں آئے۔۔۔ آج صبح بہت نمازی گھر واپس نہیں آئے۔ کیسی کیسی وحشت ناک خبریں اور بدشگنی کے کلمے سننے میں آئے۔ کوئی کہتا تھا کہ مسجد کے مینار سرنگوں ہیں اور صحن مسجد میں نمازیوں کا خون بہتا ہے۔ کوئی خبر لایا کہ ایک ناقہ سوار سبز پوش آئے تھے۔ نمازیوں کو ان کے پیچھے جاتے دیکھا تھا۔ بدشگنی کے کلمے ایسے منھ سے نکلے کہ جو نہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ گلی کے پچھواڑے توپیں دغنے لگیں۔

حویلیاں گرنے لگیں، بابا جان نے سارے کنبہ کو ساتھ لیا۔ تمھارے گھر گئے، خالہ حضرت کو ہمراہ لیا اور بھری حویلی چھوڑ نکل پڑے۔ ایسی بدحواسی میں نکلے کے کوئی سامان ساتھ نہ لیا۔ تقن میاں نے پنجرا طوطے کا ضرور ساتھ لیا تھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ توقف کیا، پھر گویا ہوئی ''بس نقد دم لے کر چلے تھے لیکن اس نقد دم کو بھی بچا کر نہ لا سکے۔ کلموئے گوروں کے پلٹن گھم گھم گلی میں گھس آئی اور ان کی گولیوں سے بھاڑ میں چنے سے بھننے لگے۔ میں کمبخت ماری دکھیاری ہول کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ نہ تن بدن کا ہوش نہ کپڑے لتے کی سدھ، بھاگتے میں چادر بھی اتر گئی۔ مجھ بدنصیب کو ابھی اور دن دیکھنے تھے کہ شاہی خادم نے جو جناب عالیہ کے مزاج اقدس کا حال لے کر بابا جان کے پاس حاضر ہوا کرتا تھا اور آج بھی اسی غایت سے اس طرف آتا تھا۔ مجھے دیکھ پایا کمال شفقت سے میرا ہاتھ پکڑا اور جناب عالیہ کی خدمت میں گریہ کرتا پہنچا۔ اس نے اپنا عمامہ زمین پہ پھینک دیا اور کہا کہ اے جناب عالیہ میرے ماں باپ آپ پر سے فدا ہوں۔ وہ حکیم دانا فخر الاطبا ارسطا طالیس زماں، جالینوس دوراں، نباض حضور کا، مزاج داں مزاج پرنور کا آج زمانے سے اٹھ گیا۔ جام شہادت نوش کر گیا۔ اس کی یہ دختر بداختر بے مقنع و چادر گھر سے بے گھر ہوئی ہے۔ اسے بصد توقیر ہمراہ لایا اور حضور میں فلک جناب کی پیش کر دیا۔

جناب عالیہ یہ خبر سن ملول ہوئیں، بندی کو شفقت کی نظر سے دیکھا، سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی کنیزی میں لے لیا۔'' بولتے بولتے وہ چپ ہوگئی۔ اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔ پھر میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کیے کیے محسوس کیا کہ جس زانو پہ اپنا سر رکھا ہے اس کے جسم کی پوری عمارت گویا بھونچال سے ہل گئی ہے۔ پھر ایک گرم آنسو ٹپ سے میری پیشانی پر گرا۔ میری ہمت نہ پڑی کہ آنکھیں کھول کر دیکھوں۔ آنکھیں بند کیے دم سادھے لیٹا رہا۔ وہ زیبا عمارت ہلتی رہی اور میں دم سادھے آنکھیں بند کیے چپ لیٹا رہا۔

صبح ہوئی تو میں نے اپنی جوتی پہ جوتی سوار دیکھی۔ ماتھا ٹھنکا کہ اللہ خیر کرے اب کیا سامنے آتا ہے اور چرخِ کج رفتار ہمیں کن جنگلوں اور دیسوں میں پھراتا ہے۔ اتنے میں شہزادمحل تشویش سے بولی کہ الٰہی خیر میری بائیں آنکھ کیوں پھڑکتی ہے۔ میں نے اس کی طرف اس نے میری طرف دیکھا۔ دونوں طرف آنکھوں میں تشویش تھی اور آنکھوں کی پتلیوں سے پرے ذہن کے کسی پردے میں گمنام اندیشے مبہم وسوسے منڈلا رہے تھے۔

جب ہم نے ارد گرد نظر ڈالی تو چاروں طرف اداسی کا سماں نظر آیا۔ شاہی خدام خاموش غمگین، کنیزیں خواصیں چپ چاپ اداس اداس، کوئی زیر زنخداں چھڑی رکھے کسی دور کے خیال میں گم ہوگئی ہے۔ کوئی نرگس آسا بادیدہ حیراں کھڑی کی کھڑی رہ گئی ہے، کوئی سر نیوڑھائے چپ بیٹھی ہے، کوئی آہ سرد بھرتی ہے۔ کسی کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو رواں ہیں۔ استفسار کیا تو پتہ چلا کہ جناب عالیہ نے خواب میں سلطان عالی کا دیدار کیا ہے۔ اس وقت سے صورت آنکھوں میں پھرتی ہے۔ یاد سلطان کی ستاتی ہے۔ جناب عالیہ کو دیکھ کر بندگان عالی بھی اداس و فکرمند ہیں اور سلطان عالم کو یاد کرتے ہیں۔

جب جناب عالیہ نے سلطان عالی کی یاد میں ہنسنے بولنے سے کنارہ کیا اور کھانا پینا ترک کیا تو مٹھو نے زبان کھولی "حق اللہ، پاک ذات اللہ، صحیح تو خدا، خدا کا رسول۔ تو غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول۔ جگ جگ جیا کرو نام نبی کا لیا کرو۔ اٹھ فقیر چل مکہ کو:

ان فی الجنۃ قصر لہن لعلی و لزہرا الحسین و حسن

بی بی کا مٹھو، بیگم کا مٹھو یوں عرض کرتا ہے کہ یہاں سے مشرق میں برس دن کی راہ ایک گھنا جنگل ہے۔ جنگل سے پرے دریا ہے، دشمنوں کا گھیرا ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک برج بلند مٹی کا بنا ہے۔ اس برج کے اندر ایک باغ ہے۔ باغ میں سرو کا ایک شجر

ہے۔سرو کے شجر میں ایک قفس آہنی کہ میرے قفس سے بہت مضبوط ٹنگا ہے۔اس میں ہمارے سلطان ذی شان علای مقام مثل اپنے مٹھو کے مقید ہیں اور وقت کا انتظار کرتے ہیں کہ کب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں، اور کب سوئے وطن مراجعت فرمائیں اور درو دیوار کو اپنے درود سے معطر و معنبر فرمائیں۔

جناب عالیہ نے طوطے کی زبان سے یہ کلمات سنے تو دل سینے میں طائر کی طرح پھڑکا اور عقل کے طوطے اڑا سفر پہ روانہ ہوئیں۔ وہ طائر ہمہ داں و جانور سحر بیان پھر چہچہایا "حق اللہ پاک ذات اللہ، صحیح تو خدا، خدا کا رسول، تو غافل نہ ہو کدا کو نہ بھول۔اے ملکہ عالم یہ طائر ہیچ مداں یہ عرض کرنے کی جرأت کرے کہ اس سفر اور سقر کی صورت ایک ہے۔رنج سفر مصائب شہر بشہر قسمت میں لکھے جائیں گے کوچہ گردی بادیہ پیمائی دشت نوردی حضور کا نصیب ہوگی اور منزل موہوم، انجام معلوم کہ فرنگی پہریدار بندوقوں اور طمنچوں سے لیس بارہ بارہ چوبیس گھنٹے باغ کے ارد گرد پہرہ دیتے ہیں اور آدمی تو کیا پرند کی مجال نہیں کہ اس باغ میں پر مار جائے۔

خدام دولت نے طائر کی زبان سے یہ کلام سنا تو دہائی دی کہ قیامت ہے کہ آگے سلطان عالی گئے۔اب ملکہ عالیہ جانے پہ تیار بیٹھی ہیں۔شوکت سلطان کی رخصت ہوگئی۔ اب زینت سلطنت کی رخصت ہونے لگی ہے۔شہر میں غدر پڑے گا۔اندھیرا ہو جائے گا۔پھر کیا تھا شہر کے کوچے کوچے میں خبر گشت کر گئی کہ آج رونق شہر کی رخصت ہے۔ زینت سلطنت کی فرقت ہے۔ملکہ عالیہ کا شہر سے سفر ہے۔بستی کے اجڑنے کی خبر ہے۔ سینکڑوں مرد و زن پیر و جواں سینہ زناں اشک فشاں ہمراہ ہوئے، غریب الوطنی پر تیار ہوئے۔غازی مرکبوں پہ زینوں کو رکھ، عمامہ سروں پہ باندھ، عبائیں دوش پہ ڈال ہتھیاروں سے آراستہ ہو نقد جاں لٹانے پہ سفر میں مر جانے پہ تیار ہوئے۔

اس ہنگام میں مجھے والد حضرت کا قول در بابت ہمسفر طائر یاد تھا اور جناب عالیہ کی

خدمت میں حاضر ہو یوں عرض پرواز ہوا کہ ملکہ عالم سفر پر خطر اور منزل دور ہے۔ دشمن گھات میں ہے۔ کٹنیاں محلہ محلہ پھرتی ہیں اور سواری اقدس کی نقل و حرکت کو ٹوہ لیتی پھرتی ہیں۔ بغل میں جاسوس ہیں۔ صفوں میں غدار ہیں کہ گھڑی گھڑی کی خبر اعدا کو پہنچاتے ہیں۔ پس اس سفر میں احتیاط لازم ہے۔ خادم دولت کو اجازت ملے کہ وہ آگے روانہ ہو، طوطا اس کا رہنما ہو۔ راہوں کے نشیب و فراز دیکھتا چلے، اونچ نیچ کی خبریں دم بہ دم بھیجتا رہے۔

ملکہ عالیہ کو یہ تجویز بہت بھائی۔ فوراً قلمدان منگا ایک شقہ سلان عالی مقام کے نام لکھا اور موتیوں کے درمیان رکھ رومال ایک شبنم کا اوپر لپیٹ ہمراہ انگوٹھی کافی چھنگلیا کی بطور نشانی ساتھ میں رکھ بندے کے سپرد کی۔ میں ملکہ عالیہ سے رخصت لے شہزادی محل کے پاس گیا۔ لیکن اس کے سامنے جاتے ہی میرے ہونٹ سل گئے۔ بہت ہمت باندھی مگر یہ خبر سنانے کی تاب اپنے میں نہ پائی۔ اس نے مجھے اس تذبذب میں مبتلا دیکھا تو خود ہی کریدا۔ تب میں نے جھجکتے جھجکتے اس پہ اپنا عزم سفر ظاہر کیا۔ منہ سے وہ کچھ نہ بولی۔ البتہ چہرے کا رنگ پیلا ہلدی پڑ گیا۔ دیر وہ چپکی بیٹھی رہی۔ میری بھی بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ پھر وہ گھبراہٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

گھبرائی گھبرائی وہ بے سبب بے مقصد صحن میں صحن سے دالان میں دالان سے کمرے میں پھرتی رہی۔ دبی زبان سے کئی بار کہا "الٰہی خیر کرے صبح سے بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔" تب ایک کنیز نے ٹوکا "بی بی چلتے وقت بدشگنی کا کلمہ منہ سے مت نکالئے۔" اس سرزنش پر وہ محجوب ہوئی۔ تب اس نے منت مانی کہ خیریت سے واپس آؤ گے تو چھوٹے حضرت کی حاضری کھلاؤں گی۔ سونے کا علم چڑھاؤں گی۔" پھر اس نے چاندی کا روپیہ لے کر شبنم کی دھجی میں لپیٹا اور میرے بازو سے باندھا۔ بولی "امام ضامن کی ضامنی میں دیا۔ جیسے پیٹھ دکھاتے ہو ویسے صورت بھی دکھائیو۔" اور اس کی آواز بھرا گئی۔ میں

نے بے تاب ہو کر اس کی طرف دیکھا، وہ رو پڑی۔ تب دامن ضبط میرے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ میں نے بے تابانہ بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ سینے سے لگانا قہر ہوا۔ اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان گرم اشکوں نے میری آتش محبت کو اور بھڑکایا اور میں نے بے تابی مین اشکوں کی دھاروں سے بھیگے رخساروں پر ہونٹ رکھ دیے۔ وقت وداع اس وفا شعار نے میری رکاب تھام لی۔ میں دیر اس کی زلفوں میں انگلیاں پھیرتا رہا کہ زلفوں سے بھٹک کر سیمیں گردن، پر، گلاب رخساروں پر، پنکھڑی لبوں پر بھٹک بھٹک گئے اور میرا دماغ اس سمن بو عطر پیرہن کی خوشبو سے بس گیا۔ ایک نشہ کے عالم میں میں نے رہوار کو ایڑ دی اور سفر پر گامزن ہوا۔

شہر سے نکلتے نکلتے سامنے اپنا خاندانی گورستان نظر آیا۔ معاً خیال آیا کہ آج ہم اجداد کی زمین چھوڑتے ہیں، جانے کب پلٹیں، پلٹیں نہ پلٹیں۔ ان اب وجد کی یاد آئی کہ گزرے ہوئے مدتیں بیت گئیں پر چونا رنگ مزار اسی طرح چمکتے ہیں اور مرمر کے سنگ مزار اسی طرح لو دیتے ہیں گویا ابھی تدفین ہوئی ہے اور ان مظلوم بدنصیب بزرگوں کی یاد آئی کہ ابھی دنیا سے اٹھے ہیں پر جانے کس گلی کس بن میں پڑے ہیں کہ نہ لحد کی آغوش میسر آائی، نہ کفن کا آنچل نصیب ہوا۔ کیسا خیال تھا کہ بے ساختہ آنکھ بھر آئی کہنہ قبور کے درمیان ایک ہرنی کو حیران حیران پھرتے اور کسی جستجو میں بھٹکتے دیکھا تو عجب سا خیال آیا کہ ہمیں جانے سے روکتی ہے۔ میں نے جلدی سے ادھر سے نگاہ پھیر لی اور گھوڑے کو ایڑ دی کہ دم کے دم میں ہوا سے باتیں کرنے لگا اور شہر پناہ سے دور نکل گیا۔ ایک نیل کنٹھ بائیں سمت کے ایک شجر سے کہ برقی تار میں جکڑا کھڑا تھا، ٹرٹراتا اٹھا اور سامنے سے رستہ کاٹتا ہوا دائیں سمت دور نکل گیا۔ میرے قدم رکے، پر دوسرے ہی لمحے میرا چابک رہوار کی پشت پہ پڑا اور ٹاپوں کی گونج میں دور دراز فاصلے گم ہوتے نظر آئے۔

تین دن میں اس طریق سفر کرتا رہا کہ جسم گھوڑے کی پشت سے پیوست اور نظریں آسمان پر جہاں طوطا پرواز کرتا چلتا تھا گویا ایک ہری بھری کیاری فضا میں تیرتی تھی اور ہم پہ سایہ کرتی چلتی تھی۔ تیسرے دن سفر نے طول کھینچا کہ شام پڑگئی اور آس پاس کوئی بستی نظر نہ آئی کہ بسیرا کریں۔ رہوار تیز گام درماندگی سے قدرے سست گام ہوا اور نظر اپنی اس ہری بھری کیاری سے بھٹک بھٹک جاتی تھی۔ ناگاہ آسمان پر ایک ستارہ دمدار نظر آیا۔ دل دھک سے رہ گیا اور بیسیوں طرح کے وسوسوں نے گھیرا اور سو سو طرف دھیان گیا۔ تادیر اس ستارہ دمدار کو تکتا رہا اور چلتا رہا۔ چلتے چلتے یکا یک طوطے کا خیال آیا۔ اب جو اس منحوس ستارے سے نظر ہٹاتا ہوں اور اس سبز کیاری کو ٹٹولتا ہوں تو اسے ندارد پایا۔ ساری چال بھول گیا۔ رستہ سفر کا گم گیا۔

طوطے میاں بولتے بولتے چپ ہو گئے۔ ہم سمجھے کہ دم لینے کو رکے ہیں لیکن دیر ہو گئی اور وہ گم سم آسمان کو دیکھتے رہے۔ رات بھیگ چلی تھی۔ طوطے کی قبر پہ سایہ کرتا گھنا پیڑ چاندنی میں ڈوبا اوس میں نہایا چپ کھڑا تھا اور مول طوطے کی قبر سے پرے یوں بکھرا پڑا تھا جیسے اوس کے ساتھ برسا ہے۔ طوطے میاں نے جنبش کی، سامنے پڑے ہوئے راکھ کے ڈھیر کو چمٹی سے کریدا، سلگتے اپلے کو چلم میں رکھ، چلم منہ سے لگا لمبے لمبے کش لیے اور پھر آسمان کو دیکھنے لگے۔ ہمیں ٹوکنے اور پوچھنے کی کہ آگے کیا ہوا جرأت نہ ہوئی۔ رات بھیگ چلی تھی اور ہمیں ہلکی ہلکی سردی لگنے لگی تھی۔ چپ چاپ وہاں سے اٹھے اور اداس اداس گھر چلے۔"

حکیم جی چپ ہوئے۔ عدالت علی کے ہاتھ سے حقے کی نے لے کر اپنی طرف موڑی اور آنکھیں بند کر خاموش حقہ پینے لگے۔ دیر تک خاموش فضا میں صرف حقے کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔ پھر حکیم جی بولے "جنتی آدمی تھے، دوسروں کے لیے بہت تکلیفیں اٹھائیں مگر جب اپنا وقت آیا تو کسی کو تکلیف نہ دی۔ ہم میں سے کسی کو بھی پتہ نہ

چلا۔ بس اتنا ضرور دیکھا کہ خلاف معمول اول شب ہمیں رخصت کر دیا اور حجرے میں جا کر پڑے رہے۔ اللہ دیا کہتا تھا کہ صبح کو طوطے بہت چیخ رہے تھے۔ جب بہت دیر انھیں چیختے چیختے ہوگئی تو میں باغ سے نکل طوطے میاں کی طرف آیا۔ پر جی طوطے میاں تھے ہی نہیں بس طوطے چلا رہے تھے میں حیران کہ طوطے میاں کو آج کیا ہوا۔ حجرے کو کھٹکھٹایا۔ کوئی نہ بولا۔ پھر دروازہ کھولا۔ طوطے میاں کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ میں بالکل یوں سمجھا کہ طوطے میاں سو رہے ہیں۔''

عدالت علی خاموش حقہ پیتے رہے۔ پھر بولے ''حکیم جی بہت رات ہوگئی۔''

حکیم جی بولے ''لو مجھے تو قصہ سناتے میں رات کا پتہ بھی نہ چلا۔ بہت دیر ہوگئی۔ مجھے تو صبح سویرے اٹھنا تھا۔''

حکیم جی کروٹ لے کر سو گئے۔ پھر عدالت علی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ نصیر نے دیر ہوئی خراٹے لینے شروع کر دیے تھے۔ مگر غنی کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ گھر کی چارپائی پہ چت لیٹا ہوا، آنکھیں آسمان پر۔ تاروں بھرا آسمان اسے یوں لگا کہ نعلوں کی کیلیں میدان میں بکھر گئیں ہیں اور اپنی ضو سے ان بلند قد بالا گردن مرکبوں کا نشان دیتی ہیں جو اس راہ سے گزر کر دور دراز میدانوں میں نکل گئے ہیں۔ مشرق کی سمت میں اسے ستاروں کا ایک جھرمٹ نظر آیا کہ گھوڑے کے سم کی شباہت رکھتا تھا۔ وہ دیر اس جھرمٹ کو تکتا رہا اور اسے یوں لگا کہ وہ دور سے آتی ہوئی ٹاپوں کی آواز سن رہا ہے۔